اپنا قاتل
100 بچوں کے قاتل کا نفسیاتی تجزیہ
ڈاکٹر خالد سہیل
مشعل

اپنا قاتل

خالد سہیل

اپنا قاتل

جاوید اقبال مغل،

سو بچوں کے قتل،

عدلیہ

اور

پولیس کی کہانی

خالد سہیل

2002

مصنف:......... خالد سہیل

پبلشر:.......... مشعل پبلشرز لاہور پاکستان

کمپوزنگ:....... محمد سلطان ظفر www.sultanzafar.com

تاریخ:.......... 2002

مصنف کا پتہ:.....

Khalid Sohail

Penthouse No 6

100 White Oaks Whitby

Ontario Canada L1P 1 B7

e-mail: info@creativepsychotherapy.com

انتساب

ان مردوں

اور عورتوں

کے نام

جن کو

انصاف کی

عدالت سے

ناانصافی کے سوا

کچھ نہ ملا

اظہارِ تشکر

یہ کتاب تخلیق کرنے اور چھپوانے کا خواب کبھی شرمندہِ تعبیر نہ ہوتا اگر

زاہد لودھی، سعید انجم اور این اگیری پاکستان جانے کی تیاری میں میری مدد نہ کرتے

عابد حسن منٹو مجھے جاوید اقبال سے ملنے کی اجازت نہ دلواتے اور قانونی معاملات میں میری رہنمائی نہ فرماتے

خواجہ شعیب، ارشاد میر، زیشان میر، شوکت زین العابدین اور توصیف زین، جاوید اقبال کے خاندان سے مجھے نہ ملواتے

ڈاکٹر طاہر منصور اپنی ماہرانہ رائے سے نہ نوازتے

انور احمد اپنی لائبریری میں تحقیق نہ کرنے دیتے

بل بیلفونٹین انگریزی میں کتاب نہ چھاپتے

پرویز ہود بھائی اور مسعود اشعر ترجمہ کرنے کا مشورہ نہ دیتے

منصور حسین اور رفیق سلطان ترجمہ کرنے میں مدد نہ کرتے

ڈاکٹر ڈینس آئزک قیمتی مشوروں سے نہ نوازتے

فوزیہ بٹ اور محمد سلطان ظفر کتاب کی ٹائپنگ اور ترتیب میں مدد نہ فرماتے

اور جاوید اقبال مغل اپنی آپ بیتی نہ سناتے

باب در باب

تعارف

جاوید اقبال مغل کی شخصیت، جس پر سو بچوں کے قتل کا الزام تھا، ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ ویسے تو ایک معصوم انسان کی زندگی کا ضائع ہونا بھی ایک اندوہناک حادثہ ہوتا ہے اور یہاں تو سو بچوں کا قاتل زیرِ بحث ہے۔ جاوید اقبال پر ان بچوں پر جبر و تشدّد اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کا الزام بھی ہے۔ جب لاہور کی عدالت میں جاوید اقبال اور اس کے ساتھیوں پر مقدمہ چلا تو جج نے ان کو موت کی سزا دی جس کا اسے قانونی طور پر اختیار تھا لیکن اسے یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ ان کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تیزاب کے ڈبوں میں ڈالنے کی سزا دیتا۔ ایسی سزا وہ اسلامی قانون کے مطابق بھی نہیں دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر سہیل نے ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے اس دردناک سانحہ کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ پاکستان میں اس قسم کے تجزیے کی روایت نہیں ہے۔ ہم جن روایات پر کاربند ہیں ان میں پچھلے سو سالوں میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ ہماری عدالتیں ان مسائل پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ سوائے ان حالات میں جن میں جج ملزم کو ذہنی مریض سمجھتے ہوئے نفسیاتی تجزیے کا حکم دیتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل کی یہ کاوش قابلِ ستائش ہے۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر سہیل جج کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرتے کیونکہ ضروری نہیں کہ وہ صرف ملزم کو ہی ذہنی مریض پاتے۔

عابد حسن منٹو

سینیر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ۔ سابق صدر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن پاکستان

پہلا باب ... ایک پاکستانی قاتل اور جج

۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء کی صبح تو معمولی تھی لیکن رات نہایت غیر معمولی اس شام اپنے کلینک کا آخری مریض دیکھنے کے بعد میں نے اپنی نرس این اگیری Anne Aguirre کو شب بخیر کہا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ کھانا کھانے کے دوران ٹیلی ویژن پر خبریں سنتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس شام خبروں کا محور پاکستان تھا۔ رپورٹر نے ناظرین کو مطلع کیا کہ لاہور کے ایک شہری جاوید اقبال مغل کو مقامی کورٹ کے جج اللہ بخش رانجھا نے سو بچوں کے قتل کے جرم کی سزا کے طور پر نہ صرف مینارِ پاکستان کے سامنے برسرِ عام پھانسی کی سزا دی ہے بلکہ موت کے بعد اس کی لاش کے سو ٹکڑے کر کے انہیں تیزاب کے ان ڈبوں میں ڈالنے کا حکم بھی دیا ہے جن میں جاوید اقبال بچوں کو قتل کر کے ان کے ٹکڑے ڈالا کرتا تھا۔

خبروں کے ساتھ ٹیلیویژن کی سکرین پر مجرم جاوید اقبال اور جج اللہ بخش رانجھا کی تصاویر بھی دکھائی گئیں۔ اس خبر نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں رات کا کھانا ختم نہ کر سکا۔ ان خبروں میں سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ تھی کہ تصویر سے نہ تو جاوید اقبال مجرم دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی جج معصوم۔ جج کے چہرے سے مجھے غصہ اور نفرت جھلکتے دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ کسی چیز کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔ جاوید اقبال کی آنکھوں، ماتھے اور چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ اس کی تصویر میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس کی خاموشی سینکڑوں الفاظ پر بھاری تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حقیقت وہ نہیں تھی جو ٹی وی کی خبروں میں دکھائی گئی تھی اور اس کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی تھی۔

اس رات جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میں نے اس واقعہ کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ پھر میرے دل نے سرگوشی کی، تم ایک ماہرِ نفسیات ہو۔ تمہیں چاہئے کہ پھانسی

گھاٹ میں جا کر جاوید اقبال کا انٹرویو لو۔ ہوسکتا ہے وہ سو بچوں کا قاتل نہ ہو۔ وہ ایک معصوم انسان ہو اور ایک غیر منصفانہ نظام کی بھینٹ چڑھ گیا ہو۔ وہ شکل سے تو مجرم دکھائی نہیں دیتا''۔

میں نے اس سرگوشی کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن میں اسے جتنا دباتا وہ اتنی ہی شدت سے ابھرتی۔ میں اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی ریڈیو یا ٹی وی کی خبر سے اتنا متاثر نہ ہوا تھا۔

اگلے دن جب میں نے اپنے چند دوستوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں لاہور جا کر پھانسی گھاٹ میں جاوید اقبال کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں تو انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

اگلی رات جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو میرے دل نے ایک اور سرگوشی کی ''عین ممکن ہے جاوید اقبال ذہنی مریض ہو اور اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہو۔ ایسا تو نہیں کہ اسے جیل کی بجائے ہسپتال میں ہونا چاہئے۔ کیا پاکستانی جج مجرموں کو نفسیاتی تجزیے کے لئے بھیجتے ہیں یا نہیں؟'' اور میں کافی دیر تک جاوید اقبال کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلی صبح میں نے اپنے عزیز دوست زاہد لودھی کو فون کیا' جو پاکستان اور کینیڈا میں بہت سے وکیلوں اور سیاستدانوں کو جانتے ہیں اور درخواست کی کہ وہ کہیں سے مجھے جج کے فیصلے کی کاپی منگوا دیں۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ دو دنوں کے بعد ان کے پاس ۷۵ صفحات پر مشتمل جج کا فیصلہ موجود تھا۔ اس فیصلے کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

اسے پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جج نے جاوید اقبال کو نفسیاتی تجزیے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ جج نے غصے اور تلخی سے جاوید اقبال کے بارے میں لکھا تھا۔

''وہ انسان کے بھیس میں ایک شیطان ہے۔ درحقیقت وہ ایک جانور ہے اور ایسے ظالم انسان کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔۔۔ استغاثہ نے ثابت کر دیا ہے اور خدا کے فضل سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ملزم نے سو بچوں کا قتلِ عمد کیا ہے اور قتل کرنے کے بعد ان بچوں کی

لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان تیزاب کے ڈبوں میں تحلیل کیا ہے جو اس کے گھر سے ملے ہیں۔اس جرم کی سزا کے طور پر مجرم کو سولی پر چڑھایا جائے گا۔اس کی لاش کے بھی سو ٹکڑے کیے جائیں گے اور پھران ٹکڑوں کو بھی تیزاب کے ڈبوں میں ڈالا جائے گا۔مجرم کو پھانسی کی سزا مینارِ پاکستان کے کھلے میدان میں لواحقین کے سامنے دی جائے گی تا کہ عوام کو اس سزا سے عبرت حاصل ہو''۔

جب میں نے جج کا فیصلہ پڑھا تو میرے ذہن میں بہت سے سوالوں نے سر اٹھانا شروع کیا:

سینکڑوں مجرموں میں سے جج نے جاوید اقبال کو ہی کیوں عبرت کے لئے چنا تھا؟

کیا جج نے ایسی سزا تو نہ دی تھی جسے دینے کا اسے قانونی طور پر حق نہیں تھا؟

جاوید اقبال کا سزا سننے کے بعد کیا ردِعمل تھا؟

جج کا فیصلہ پڑھنے کے بعد میرے دل میں لاہور جا کر جاوید اقبال کا انٹرویو لینے کی خواہش میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی۔ایسا کرنے کے لئے چند دنوں کے لئے کلینک کو بند کرنا ضروری تھا۔ میں نے اپنی نرس این سے مشورہ کیا تو وہ پوچھنے لگی ''اگر پاکستان میں فوج کا راج ہے اور جاوید اقبال پھانسی کا انتظار کر رہا ہے تو تمہارے جاوید اقبال کو انٹرویو کرنے کے کیا امکانات ہیں؟''

''پاکستان میں ہر چیز ممکن ہے''

''وہ کس طرح؟''

'' اگر انسان صحیح لوگوں کو جانتا ہو''

'' اس نظام میں اگر ایک شخص اجازت دے بھی دے تو دوسرا اسے مسترد کر سکتا ہے''۔

'' لیکن میری خواہش ہے کہ میں اس سفر پر روانہ ہو جاؤں اور قسمت آزمائی کروں''۔

چنانچہ میں ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جو میری اس سلسلے میں مدد کر سکتے تھے۔آخسر مجھے عابد حسن منٹو کا خیال آیا۔میری ان سے ملاقات سویڈن کی ایک ادبی کانفرنس میں ہوئی تھی جہاں میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا اور انہوں نے اس کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی۔کانفرنس کے بعد وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئے تھے۔

میں نے ناروے میں اپنے دوست سعید انجم کو فون کیا جس نے مجھے عابد حسن منٹو سے متعارف کروایا تھا۔سعید انجم نے نہ صرف مجھے منٹو صاحب کا فون نمبر دیا بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

جب میں نے لاہور فون کیا تو منٹو صاحب نے خود ہی فون اٹھایا اور بہت اپنائیت سے بات چیت کی۔میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ پاکستان میں جاوید اقبال کا انٹرویو لینے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔وہ کہنے لگے ''آپ مجھے دو دن کے بعد فون کریں،میں معلومات کر کے بتاؤں گا''۔میں نے دوبارہ فون کیا تو فرمانے لگے''میں نے لاہور سیکریٹریٹ میں ایک وزیر سے بات کی ہے جس نے اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔اس کا مشورہ ہے کہ آپ فوراً لاہور تشریف لے آئیں۔ نجانے کب جاوید اقبال کو سولی پر چڑھا دیا جائے''۔

میں نے اپنی ٹریول ایجنٹ کو فون کیا تو وہ کہنے لگیں کہ ویسے تو پاکستان کا ہوائی ٹکٹ بارہ سو ڈالر کا ہوتا ہے لیکن چونکہ میں جلدی میں جانا چاہتا تھا اس لئے وہ سترہ سو ڈالر کا ہوگا۔میں نے سوچا کہ ایک بڑے مقصد کے لئے پانچ سو ڈالر کی قربانی دی جا سکتی ہے چنانچہ میں نے ٹکٹ خرید لیا۔این اگیری نے ایک ہفتے کے لئے کلینک بند کر دیا اور میں نے لاہور جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس شام میں نے گھر والوں کو فون پر اطلاع دی کہ میں چند دنوں کے لئے لاہور آرہا ہوں۔وہ یہ خبر سن کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔پھر میں نے اپنے کزن خواجہ شعیب کو فون کیا جو ایک

مخلص انسان اور محبت کرنے والا دوست ہے۔ جب میں نے اسے پاکستان آنے کی وجہ بتائی تو وہ کہنے لگا کہ وہ اپنے دفتر سے چند دن کی چھٹی لے، لے گا تاکہ میری ہر طرح سے مدد کر سکے۔

==========

دوسرا باب ... جب قاتل ذہنی مریض ہوں

پاکستان جانے کی تیاریاں کرتے ہوئے میں اپنے بیس سال کے تجربات کے بارے میں سوچنے لگا۔ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے میں نے کئی نفسیاتی ہسپتالوں میں کام کیا تھا اور بہت سے ایسے مریضوں کا انٹرویو لیا تھا جو قانون کی نگاہ میں مجرم تھے اور عدلیہ نے انہیں جیل بھیج رکھا تھا۔میں ان مریض مجرموں سے ملنے جیلوں میں بھی جا چکا تھا۔میرے رفیق کار اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ میں ذہنی مریضوں کے لئے جارہانہ رویے کی بجائے ہمدردانہ رویے کا قائل ہوں۔میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مریضوں کو جیل میں بھی وہ علاج ملتا رہے جو ان کا انسانی حق ہے۔

ان تمام ذہنی مریضوں میں سے جن کا میں نے پچھلی دو دہائیوں میں علاج کیا تھا دو مریض ایسے تھے جن کی کہانیوں نے میرے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔دونوں پیرانائڈ سکزوفرینیا Paranoid Schizophrenia کے مریض تھے اور دونوں اپنے عزیزوں کے قاتل تھے۔

پہلے مریض نے ذہنی توازن کھونے کے بعد اپنی بیوی کو قتل کیا تھا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی کے اس کے دوست کے ساتھ جنسی تعلقات تھے۔اس حادثے کے بعد اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا تاکہ اسکا علاج ہو سکے۔کئی سالوں کے مسلسل علاج کے بعد اسے افاقہ ہو گیا تھا اور وہ ایک صحتمند زندگی گزارنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن ہسپتال کے اصحابِ اختیار اسے ہسپتال میں ہی رکھنا چاہتے تھے۔میں ہر سال اس کے ساتھ ریویو بورڈ Review Board کے سامنے پیش ہوتا تھا اور اسکی وکالت کرتا تھا لیکن ہسپتال اور حکومت کا ریویو بورڈ اسے چھٹی دینے کے لئے تیار نہ تھا۔وہ اسے معاشرے کے لئے خطرناک مریض سمجھتے تھے۔

آخرایک دن وہ مریض روپوش ہو گیا۔ ہسپتال کے عملے اور پولیس نے اسے بہت تلاش کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ کئی سال گزر گئے اور اسکی کوئی خبر نہ آئی۔ پھر ایک دن مجھے مقامی پولیس کا فون آیا کہ وہ میرے مریض کو ہوائی اڈے سے ہسپتال لا رہے ہیں۔ میں یہ خبر سن کر بہت حیران ہوا۔ جب مریض ہسپتال پہنچا تو مجھے بہت تپاک سے ملا۔ انٹرویو کے دوران مجھے اس میں دیوانگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کنیڈا کے ایک شہر ونی پیگ Winnepeg چلا گیا تھا اور وہاں امن وسکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ایک الیکٹریشن Electrician کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پرسکون زندگی رہا تھا۔ اس پر سخت وقت اس وقت آیا جب بدقسمتی سے اس کی بلڈنگ میں ایک قتل کی واردات ہوئی اور پولیس نے تفتیش کے دوران یہ جان لیا کہ وہ اونٹاریو Ontario کے ایک نفسیاتی ہسپتال سے بھاگا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اسے ہتھکڑیاں لگا کر اور ہوائی جہاز میں بٹھا کر واپس لے آئے۔ میں نے ہسپتال کے اصحابِ بست وکشاد کو ایک دفعہ پھر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ بے ضرر ہے اب صحت یاب ہو چکا ہے اور اس سے کسی کی جان اور مال کو کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن وہ نہ مانے اور اسے دوبارہ دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میں اس مریض اور واقعہ سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ میں نے اس کے حوالے سے ''ٹوٹا ہوا آدمی'' ایک ناول بھی لکھا تھا۔

میرا دوسرا مریض ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا جس کے گلے میں ٹریکیئوسٹمی tracheostomy کی ٹیوب لگی رہتی تھی۔ اس نے بھی دیوانگی کے عالم میں اپنی والدہ کا قتل کر دیا تھا۔ جب عدالت میں اسکی دیوانگی ثابت ہو گئی تھی تو اسے جیل بھیجنے کی بجائے علاج کے لئے ہسپتال بھیجا گیا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس کی والدہ نے وراثت میں دس لاکھ ڈالر چھوڑے تھے۔ چونکہ مریض کا صرف ایک ہی بھائی تھا اس لئے دونوں کو پانچ پانچ لاکھ ڈالر ملے تھے۔ بعض لوگ طنز سے کہا کرتے تھے کہ اسے اپنی ماں کو قتل کرنے کے پانچ لاکھ ڈالر ملے ہیں۔ اس مریض کی کہانی کا ایک

اور دلچسپ پہلو یہ تھا کہ جب نوجوانی میں پہلی دفعہ اس پر دیوانگی کا دورہ پڑا تھا تو اس نے اپنے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ اسکے گلے میں سرطان ہے۔اس وقت ڈاکٹروں نے کہا تھا تمہیں وہم ہے تمہارا گلہ بالکل ٹھیک ہے۔تیس سال کے بعد جب اس کے گلے کے سرطان کی تشخیص ہوئی اور آپریشن ہوا تو اس نے ڈاکٹر سے کہا ''میں آپ سے تیس سال سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے سرطان ہے اور آپ مانتے ہی نہیں تھے''۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اس دیوانے نے اپنے سیانے ڈاکٹر کو لاجواب کر دیا تھا۔میں نے سوچا اگر جاوید اقبال کنیڈا میں ہوتا تو اسے ضرور کسی ماہرِ نفسیات کے پاس بھیجا جاتا۔ویسے تو این میری حوصلہ افزائی کر رہی تھی لیکن ایک دن پوچھنے لگی ''اگر جاوید اقبال نے انٹرویو دینے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟''

''آخر وہ انکار کیوں کرے گا؟''

میں بہت پرامید تھا کہ وہ مجھ سے ضرور بات چیت کرے گا۔

==========

تیسرا باب ... امریکہ اور سیریل قاتل

جب ہم بیسویں صدی میں قاتلوں کے رجحانات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی چند دہائیوں میں ساری دنیا میں سیریل قاتلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور امریکہ میں ایسے قاتلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

سٹیو ایگر Steve Egger اپنی کتاب سیریل مرڈر Serial Murder میں رقمطراز ہیں ''امریکہ میں ساری دنیا کے ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ سیریل قاتل پائے جاتے ہیں''۔ ایلیٹ لیٹن Elliott Leyton اپنی کتاب ہنٹنگ ہیومنز Hunting Humans میں لکھتے ہیں ''امریکہ کی حالت اس حوالے سے بہت تشویشناک ہے کہ وہاں سیریل قاتلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک وہ خال خال تھے۔ لیکن اب تقریباً ہر مہینے ایک سیریل قاتل پکڑا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ میں تقریباً سو سیریل قاتل موجود ہیں جو ہزاروں معصوموں کی جانیں لے چکے ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیریل قاتلوں کی تعداد ساری دنیا میں کیوں بڑھ رہی ہے اور امریکہ میں ان کی تعداد سب سے زیادہ کیوں ہے؟ اس سوال پر بہت سے ماہرینِ نفسیات اور سماجیات نے غور و خوض کیا ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اس رجحان کا ذمہ دار صنعتی انقلاب ہے۔ جب لوگ دیہات سے شہر کا رخ کرتے ہیں تو اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں اور بڑے شہروں کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔ ان کی تنہائی اور یاسیت انکے تشدد کے جذبات کو بھڑکاتی ہے۔

دیگر ماہرین اس رجحان کا ذمہ دار سماجی ناانصافیوں اور معاشی ناہمواریوں کو ٹھہراتے

ہیں۔ان کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں امیروں اور غریبوں کے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور امریکہ جیسے امیر ملک میں لاکھوں انسان اور خاندان ایسے ہیں جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں (خوراک' لباس اور مکان) سے محروم ہیں۔سٹیوارٹ پامر Stuart Palmer لکھتے ہیں ''جب انسانوں کو زندگی کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جائے تو یہ احساسِ محرومی آہستہ آہستہ تشدد کا روپ دھار لیتا ہے''۔

جب لوگوں کا احساسِ محرومی غصے میں اور غصہ تشدد میں ڈھلتا ہے تو وہ ان انسانوں اور نظاموں پر حملہ آور ہوتے ہیں جنہیں وہ ان ناانصافیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔بعض دفعہ جب صبر کا پیمانہ چھلک جاتا ہے تو غصہ' نفرت' تلخی اور تشدد پرامن شہریوں کو اپنی زد میں لے لیتے ہیں اور معاشرے میں معصوموں کی زندگی بھی محفوظ نہیں رہتی۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ معاشرے میں نسلی بے انصافیاں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔جب معاشرے میں کالوں' بھوروں اور گوروں کو برابر کے حقوق نہ ملیں تو اس سے بھی عوام میں غصہ اور تشدد بڑھتا ہے۔

بعض اصحابِ نظر کا خیال ہے کہ تشدد کے مسئلے کی جڑ معاشی اور سماجی نہیں جذباتی اور روحانی ہے۔ان کا خیال ہے کہ جوں جوں لوگوں کا روحانی دیوالیہ ہو رہا ہے اور ان کی خوداعتمادی میں دراڑیں پڑ رہی ہیں وہ تشدد کا شکار ہو رہے ہیں۔

یہ بھی ایک دلچسپ مشاہدہ ہے کہ دنیا میں سیریل قاتلوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر رہے ہیں۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ امریکی خواب بھی اس مسئلے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ میں ہر چیز ممکن ہے اور ہر خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے اسی لئے ساری دنیا سے خواب دیکھنے والے عوام اور خواص امریکہ کا رخ کرتے ہیں۔جن کے خواب

پورے ہو جاتے ہیں وہ تو جشن مناتے ہیں لیکن جن کے خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو جاتے ہیں وہ غصہ، تلخی اور تشدد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں ہالی وڈ کے ہیرو اور کاؤبوائے Cowboy بھی پیدا ہوتے ہیں اور بدنامِ زمانہ قاتل بھی۔

یوں لگتا ہے امریکی معاشرہ آہستہ آہستہ انتہا پسندوں کا معاشرہ بنتا جا رہا ہے جہاں معاشرے کے بدترین اور بہترین ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

===========

چوتھا باب ... مشہورِ زمانہ قاتلوں کی شخصیت

جب بھی میں سیریل قاتلوں کے بارے میں سوچا کرتا تھا میرے ذہن میں مندرجہ ذیل سوال ابھرتے تھے:

وہ کس قسم کے لوگ ہوں گے جو اس قسم کا طرزِ حیات اپناتے ہونگے ؟

ان کے خاندانوں کی روایت کیسی ہوگی ؟

ان کا بچپن کس قسم کے ماحول میں گزرا ہوگا ؟

ان کی شخصیات کن خطوط پر پروان چڑھی ہوں گی ؟

جب میں نے سیریل قاتلوں کی شخصیات اور طرزِ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنی شروع کی اور ماہرین کی آرا کا مطالعہ شروع کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ ان لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں جو:

قبائلی جنگوں میں شریک ہو کر دشمنوں کو قتل کرتے ہیں

غصے میں آ کر اپنے دشمن کو مار ڈالتے ہیں ایسے دشمن جنہیں وہ بخوبی جانتے ہیں پیسے لے کر کسی کو قتل کرتے ہیں اور اس طرح اپنی روزی کماتے ہیں

کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کے ممبر ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی میں بائیں بازو اور دائیں بازو کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے سیاسی مقاصد کی خاطر ہزاروں قتل کیۓ ہیں۔

جدید سیریل قاتل آشناؤں کی بجائے انجانے معصوم اجنبیوں کو قتل کرتے ہیں۔

ماہرِ نفسیات لنڈ Lunde لکھتے ہیں ”ایک دفعہ قتل کرنے والوں اور سیریل قاتلوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی قسم مقتول کو اچھی طرح جانتی ہے جبکہ سیریل قاتل اجنبی انسانوں کو قتل کرتے ہیں“۔

جب میں نے سیریل قاتلوں کے خاندانوں کا مطالعہ کیا تو میرے سامنے دو گروہ آئے۔ پہلے گروہ میں وہ سیریل قاتل شامل ہیں جو یا تو یتیم خانوں میں پلے بڑھے اور یا ان پر ان کے والدین نے بہت سے مظالم ڈھائے۔ انہیں کبھی اپنے ماں باپ کا پیار نہیں ملا۔ وہ بزرگوں کی محبت اور شفقت سے محروم ہی رہے اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کی شخصیت میں غصہ، نفرت، تلخی اور تشدد کوٹ کوٹ کر بھر چکے تھے۔

امریکہ کے ہنری لی لیوکس نے، جس نے سو سے زیادہ لوگوں کو قتل کرنے کا دعوی کیا تھا، اپنے بچپن کے بارے میں کہا تھا ''میری ماں مجھے مجبور کرتی تھی کہ جب وہ مردوں کے ساتھ جنسی مباشرت کر رہی ہوتی تھی میں کمرے میں رہوں۔ میں اس ماحول سے اتنا بیزار تھا کہ میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔''

جس طرح لیوکس پر اس کی ماں ظلم کرتی تھی اسی طرح کنیڈین قاتل مائیکل میگرے اور بوسٹن کے البرٹ ڈی سلوو پر ان کے والد مظالم ڈھاتے تھے۔ ڈی سلوو کا باپ باقاعدگی سے اپنی بیوی اور بیٹے کو مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ البرٹ نے اپنے باپ کو اپنی ماں کی انگلیوں کی ہڈیاں توڑتے دیکھا تھا۔ میگرے کا باپ جو ایک شرابی تھا جانوروں کو نہ صرف خود مارتا پیٹتا تھا بلکہ اپنے بیٹے کو بھی اس کی ترغیب دیتا تھا۔

جرمنی کے پیٹر کرٹن کا بیان ہے کہ اسکا باپ اپنے بچوں کے سامنے انکی ماں کے ساتھ پہلے مباشرت اور پھر ظلم و تشدد کا مظاہرہ کرتا تھا۔

بہت سے سیریل قاتلوں کی سوانح عمریاں بتاتی ہیں کہ انہوں نے بچپن میں اپنے والدین سے جانوروں پر ظلم کرنا سیکھا تھا۔ جانوروں پر ظلم کرنا ایک ایسی سنجیدہ علامت ہے جو بچپن میں ہی کسی کے بڑے ہو کر ظالم اور قاتل ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔

قاتلوں کے دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جنہیں ماں باپ نے ان کی ہر جائز و

ناجائز خواہش پوری کر کے بگاڑ رکھا تھا۔ امریکہ میں مارک ایسکس ایسے خاندان میں پلا بڑھا تھا جہاں اسے ڈھیروں پیار ملا تھا۔ وہ بڑے ہو کر ایک پادری بننا چاہتا تھا۔ جب وہ فوج میں گیا تو اسے تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ جب لوگ اسے نگر nigger کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے تو اس کے دل میں گوروں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوتے۔ یہ نفرت بڑھتے بڑھتے تشدد کا روپ دھارتی گئی اور آخر ایک دن اسنے ایک ہوٹل کو جلا کر نو لوگوں کو زخمی اور دس لوگوں کو مار ڈالا۔

دنیا بھر کے قاتلوں کی کہانیاں پڑھتے ہوئے میں جاوید اقبال کے حالاتِ زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔

===========

پانچواں باب ... پاکستان کا سفر

پی آئی اے کی چھبیس گھنٹے کی طویل پرواز کے دوران میں پاکستان میں گزاری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے گھر میں اجنبی پایا تھا۔ مجھے ہمیشہ اس فضا میں گھٹن کا احساس ہوا تھا اسی لئے میں ایک دن مشرق کو خیر باد کہہ کر مغرب میں آبسا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کا اظہار اپنے ایک شعر میں یوں کیا تھا

ے اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

مشرق کے غیر منصفانہ اور جابرانہ ماحول میں رہتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اپنی تخلیقی کاروائیوں اور غیر روائتی سوچ کی وجہ سے یا میں پاگل خانے پہنچ جاؤں گا اور یا مجھے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

مشرقی ماحول کی آزمائشوں کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں شہرِ لاہور کی بہت سی سہانی یادیں بھی محفوظ تھیں۔

اگرچہ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پشاور میں گزارا تھا لیکن میں ہمیشہ بڑے شوق سے لاہور جایا کرتا تھا۔

بچپن میں اپنی نانی اماں سے ملنے جن کی محبت مجھے انسان دوستی کے اصول سکھاتی تھی۔

نوجوانی میں اپنے چچا عارف عبدالمتین سے ملنے جو دانائی کا سرچشمہ تھے۔

اور

جوانی میں پاک ٹی ہاؤس جا کر ادیبوں اور شاعروں سے ملنے۔ لاہور کی سیر مجھے ایک بہتر انسان اور ادیب بننے کی تحریک بخشتی تھی۔

میرے لئے لاہور ولیوں اور دانشوروں کا شہر تھا۔ وہ تہذیب اور ثقافت کا گہوارہ تھا جس کی کوکھ سے ان گنت ادبی' سیاسی اور مذہبی تحریکیں جنم لے چکی تھیں۔ لاہور پاکستان اور پنجاب کا دل تھا اور مشہور تھا کہ لاہور میں سات دن میں آٹھ تہوار منائے جاتے ہیں۔ ساری دنیا سے لوگ اس شہر کی طرف کچے دھاگے سے کھنچے چلے آتے تھے۔

بعض داتا گنج بخش علی ہجویری کی خدمت میں حاضری دے کر ان کے مزار پر پھول اور چادر چڑھانے (جن کی تخلیق ''کشف المحجوب'' صوفیانہ ادب میں گرانقدر اضافہ تھی)۔

بعض شالامار باغ میں مادھولال حسین کی یاد میں چراغوں کے میلے میں شریک ہونے

اور

بعض مینارِ پاکستان' لاہور قلعہ' علامہ اقبال کا مزار اور بادشاہی مسجد کی سیر کرنے۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ لاہور کی ہیرا منڈی بھی بادشاہی مسجد کے پہلو میں بستی تھی اسلئے شہر کے ولیوں اور پاپیوں میں زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

اس دفعہ میں لاہور اپنے خاندان سے نہیں جاوید اقبال سے ملنے جا رہا تھا۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ ذہنی مریض ہے یا قاتل؟ اسے جیل میں ہونا چاہئے یا ہسپتال میں؟ اس نے اپنے ماحول سے اور معاشرے نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ اس دفعہ میں انجانی منزلوں کے انجانے سفر پر نکلا ہوا تھا۔

==========

چھٹا باب ... قانون کی نگاہ میں

لاہور پہنچ کر پہلے میں اپنے خاندان سے ملا اور جیٹ لیگ jetlag کی آزمائش سے نبرد آزما ہوا پھر میں نے عابد حسن منٹو کے ہاں فون کیا۔ ان کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ ایک دن کے لئے کسی سیاسی میٹنگ میں شریک ہونے شہر سے باہر گئے ہیں۔ میں نے اگلے دن فون کیا تو وہ مل گئے اور فرمانے لگے "آپ کل میرے دفتر تشریف لے آئیں پھر ہم دونوں سیکریٹریٹ چلیں گے"۔

چنانچہ حسبِ وعدہ وہ مجھے لے کر سیکریٹریٹ پہنچے۔ وزیر صاحب نے بڑے احترام سے ہمیں دفتر میں بلایا اور باقی مہمانوں سے انتظار کرنے کو کہا۔ میرے تعارف کے بعد وزیر صاحب نے جیل کے انسپکٹر جنرل کو فون کیا۔ انہوں نے سپیکر کا بٹن بھی دبا دیا تا کہ ہم ان کی گفتگو سن سکیں۔ کہنے لگے "ڈاکٹر سہیل میرے پاس موجود ہیں۔ وہ ایک ماہرِ نفسیات ہیں اور سیریل قاتلوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ جاوید اقبال مغل کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں"۔

" سر۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک خطرناک مجرم ہے۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں۔ اسے کسی دن بھی سولی پر چڑھا دیا جائے گا"۔ کمرے میں چند لمحوں کے لئے ایک تکلیف دہ خاموشی پھیل گئی۔ پھر وزیر صاحب نے کہا "ڈاکٹر سہیل اپنے ساتھ عابد حسن منٹو کو لے کر آئے ہیں۔ وہ میرے معزز استاد ہیں۔ میں انہیں "نہ" نہیں کہہ سکتا"۔ I just cannot say NO to him

" سر۔ اگر یہی بات ہے تو پھر آپ ایک خط لکھ کر ڈاکٹر سہیل کو بھیج دیں اور میں انٹرویو کا انتظام کر دوں گا"۔

"آپکے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔"

چنانچہ وزیر صاحب نے خط لکھ دیا اور میں اور منٹو صاحب سیکریٹیریٹ سے لوٹ آئے۔جب ہم گاڑی میں واپس آرہے تھے تو میں نے منٹو صاحب سے پوچھا۔

''کیا پاکستانی قانون کے مطابق کسی کو پھانسی کی سزا دی جاسکتی ہے؟''

منٹو صاحب چند لمحے خاموش رہے پھر بولے''اگر کوئی قتلِ عمد کا مرتکب ہوا ہے تو پاکستانی قانون کے مطابق عدالت اسے پھانسی کی سزا دے سکتی ہے۔یہ قانون انگریزوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔یہی قانون ہندوستان میں بھی رائج ہے۔آزادی کے بعد پاکستانی قوانین میں چند اسلامی قوانین بھی شامل کر دئے گئے ہیں جو''حدود کے قوانین'' کہلاتے ہیں۔ان قوانین میں بھی چند جرائم کی سزا موت ہے۔پچھلے دنوں پاکستان میں Hijacking Law بھی بنا ہے اس کے تحت بھی پھانسی کی سزا ہوسکتی ہے''۔

جب ہم منٹو صاحب کے گھر پہنچے تو ان کی بیگم نے ہمارا استقبال کیا جو نہ صرف ایک اچھی میزبان ہیں بلکہ ایک جانی پہچانی افسانہ نگار بھی ہیں۔انہوں نے نہایت پرتکلف چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔چائے کے دوران میں نے منٹو صاحب سے پوچھا ''جاوید اقبال کو سزا دیتے ہوئے جج نے اسے یادگارِ پاکستان کے سامنے پھانسی دینے کا حکم دیا ہے۔کیا پاکستان میں سرِ عام پھانسی دینے کی روایت موجود ہے؟''۔

''ہاں۔پاکستان میں ضیاء الحق کے دور میں ایک دفعہ ایسا ہو چکا ہے۔ضیا نے جب ملک میں مارشل لا نافذ کیا تھا تو اس نے پاکستانی عدالتوں میں نئے قوانین بھی متعارف کروائے تھے۔اس دور میں لوگوں کو کوڑے بھی لگائے گئے تھے اور انہیں اسلامی سزا قرار دیا گیا تھا۔ضیا کے دور میں ایک دفعہ تو برسرِ عام پھانسی کی سزا دی گئی تھی لیکن جب دوسری دفعہ ایسی سزا کا حکم ہوا تھا تو انسانی حقوق کا تحفظ کرنے والے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے احتجاج کیا تھا اور پھر وہ سزا نہیں دی گئی تھی''۔

”جاوید اقبال کے معاملہ میں جج نے پھانسی کے بعد اسکی لاش کے سو ٹکڑے کرنے اور ان ٹکڑوں کو تیزاب کے ڈبوں میں ڈالنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اس کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟“

”میرا خیال ہے جج جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ کسی لاش کو سزا دینے کی کسی جج کو قانونی اجازت نہیں ہے۔ اس حکم پر اخباروں میں بہت احتجاج بھی ہوا تھا۔ جب یہ کیس ہائی کورٹ میں جائے گا تو ہائی کورٹ اس سزا کو قبول نہیں کرے گا۔ صوبہِ پنجاب کے گورنر نے بیان دیا ہے کہ اگر جاوید اقبال نے اس سزا کے خلاف اپیل نہ کی تو حکومت خود اپیل کرے گی“۔

میں نے منٹو صاحب اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا اور گھر لوٹ آیا۔ راستے میں میں سوچتا رہا کہ منٹو صاحب کی شخصیت اور انکی گفتگو کتنی شستہ اور نپی تلی ہے۔ وہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ میں ان کی شخصیت کے وقار اور متانت سے بہت متاثر ہوا۔

==========

ساتواں باب ... پھانسی گھاٹ کا دورہ

جب میں وزیر صاحب کا خط لے کر جیلوں کے انسپکٹر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے جاوید اقبال مغل کو ۷ اپریل ۲۰۰۰ء کو انٹرویو کرنے کا اجازت نامہ دے دیا۔ جب میں نے شعیب کو بتایا کہ مجھے انٹرویو لینے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل جانا ہے تو اس نے دفتر سے چھٹی لی اور مجھے وہاں لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

جب ہم ۷ اپریل کی صبح کو جیل کے دروازے پر پہنچے تو گیٹ کیپر نے روک لیا۔ پہلے کار کی تلاشی لی اور پھر بیسیوں غیر ضروری سوال پوچھے اور آخر میں ایک خاص رجسٹر پر دستخط کروائے۔ ان سوالوں سے شعیب طیش میں آتا رہا جبکہ میں محظوظ ہوتا رہا۔ ایسے حالات میں میں اکثر سوچتا ہوں کہ حکومت کے محکموں میں کام کرنے والے لوگ عقلِ عامہ سے کیوں کام نہیں لیتے۔ میں نے جیل کی عمارت کی طرف دیکھا تو اسکی اونچی دیواروں پر بجلی کے تار نظر آئے تاکہ قیدی فرار نہ ہو سکیں۔ گیٹ کیپر نے دروازہ کھولا تو کہنے لگا ''آپ جلدی سے اندر چلے جائیں سپریٹنڈنٹ صاحب پانچ منٹ بعد ایک میٹنگ میں جانے والے ہیں''۔

میں اور شعیب آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید مرسیڈیز اور کئی مسلح سپاہی سپریٹنڈنٹ صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ شعیب نے مجھے جلدی سے اتارا اور خود کار پارک کرنے چلا گیا۔ میں آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سپریٹنڈنٹ صاحب دفتر سے باہر نکل رہے ہیں اور سپاہی انہیں ایسے سلوٹ کر رہے ہیں جیسے فوجی کسی صدرِ مملکت کو سلوٹ مار رہے ہوں۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ پاکستان میں جیل کے سپریٹنڈنٹ کی اتنی شان ہوتی ہے۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر وزیر کا خط پیش کیا تو وہ بڑے احترام سے مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور اپنے اسسٹنٹ شمشیر خان سے تعارف کروا کر کہنے لگے ''میں تو ایک میٹنگ

میں جا رہا ہوں لیکن شمشیر خان آپ کو جاوید اقبال کی کوٹھڑی میں لے جائے گا''۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وزیر کا خط وہ چابی تھی جو بہت سے تالے کھول سکتی تھی۔ میں نے ایسا ہی کچھ سوچ کر ایک دن این سے کہا تھا ''پاکستان میں ہر ممکن چیز ناممکن اور ہر ناممکن بات ممکن ہو سکتی ہے''۔

اتنی دیر میں شعیب بھی کار پارک کر کے آ گیا۔ شمشیر خان نے شعیب کو ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کو کہا اور مجھے لے کر جیل کے احاطے کی طرف چل دیا۔ جیل کا بہت بڑا لکڑی کا پھاٹک اور اسکا پرانا زنگ آلود تالا دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ انیسویں صدی کی نشانی ہوں۔

''آپ کی جیل میں کتنے قیدی ہیں؟'' میں نے پوچھا

''۲۴۸۵۔ ویسے ہر ہفتے ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ بہت بڑی جیل ہے''

مجھے اس لمحے بخش لائلپوری کا شعر یاد آیا

؎ ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

میں جیل کے احاطے سے گزر رہا تھا تو مجھے سینکڑوں قیدی مختلف کاموں میں مصروف دکھائی دیے۔ مجھے جیل کی دیواروں پر قرآنی آیات دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

''یہ آیتیں کب لکھی گئی تھیں؟'' میں نے شمشیر خان سے پوچھا۔

''ضیاء الحق کے دور میں''۔

اس دور میں ملک کے ہر ادارے کو مذہب کی لوہے کی ٹوپیاں پہنا دی گئی تھیں۔ میں اس زمانے میں پاکستان آیا تھا تو مجھے پہلی دفعہ پی آئی اے کی پرواز کے دوران قرآنی آیات سنائی دی تھیں یہ علیحدہ بات کہ ان آیات کے باوجود ضیاء الحق کا جہاز فضا میں تباہ و برباد ہو گیا تھا۔

''شمشیر صاحب! آپکی جاوید اقبال کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' میں دوبارہ ذہنی طور پر جیل میں آ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اس جیل میں پچھلے پندرہ سال سے کام کر رہا ہوں۔ میں نے

جاوید اقبال جیسا غیر معمولی انسان نہیں دیکھا He is a very deep man میں چند قدم آگے بڑھا تو مجھے ''پھانسی گھاٹ'' کی تختی نظر آئی۔

''کیا آپ مجرموں کو الیکٹرک چیر Electric chair کے ذریعے پھانسی دیتے ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! یہ امریکہ نہیں پاکستان ہے' اور شمشیر خان ایک وحشیانہ ہنسی ہنسا ''یہاں مجرم کے گلے میں پھندا ڈال کر نیچے سے تختہ کھینچ دیا جاتا ہے''۔

''کیا آپ Capital punishment کے حق میں ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! آپ شاید کوئی فلسفی یا شاعر ہیں اس لئے ایسے سوال پوچھ رہے ہیں۔ ہمارا مسئلہ تو روزی' روٹی اور نوکری کا ہے۔ یہاں انسانی حقوق کی باتیں کرنے کا کسی کو وقت نہیں ہے''۔

شمشیر خان کی باتیں سن کر مجھے سٹیون کنگ Stephen King کی فلم گرین مائل Green Mile یاد آ گئی جس میں Electric chair کے دردناک مناظر دکھائی گئے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو جاوید اقبال سے صرف ایک گھنٹہ ملنے کی اجازت ہے''

''ایک گھنٹہ تو اس کی کہانی سننے کے لئے نہایت ناکافی ہے''

''لیکن یہی جیل کا قانون ہے۔ پھانسی گھاٹ کے مجرموں کو دن میں دو دفعہ آدھ گھنٹے چہل قدمی کی اور ہفتے میں ایک گھنٹہ کسی مہمان سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس ہفتے کے مہمان آپ ہیں'' پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولا ''اگر وہ اگلے ہفتے تک زندہ رہا تو آپ اس سے ملنے دوبارہ آ سکتے ہیں''۔

جب میں پھانسی گھاٹ کے علاقے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف وہ

علاقہ تھا جہاں مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی اور دوسری طرف تین کمرے تھے جن میں مجرم قید تھے۔ان کمروں کے باہر بھاری تالے لگے ہوئے تھے۔کمروں کے سامنے چھوٹا سا صحن تھا جس میں قیدیوں کو چہل قدمی کی اجازت دی جاتی تھی۔صحن کے باہر ایک اور دروازہ تھا جس پر ایک مسلح سپاہی متعین تھا تا کہ چہل قدمی کے دوران کہیں مجرم فرار نہ ہو جائیں۔

میں احاطے میں داخل ہوا تو مجھے صحن میں دو کرسیاں اور ایک میز دکھائی دیئے جو ہمارے انٹرویو کے لئے رکھے گئے تھے۔شمشیر خان نے آگے بڑھ کر جاوید اقبال کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولنا شروع کیا تو مجھے کوٹھڑی کے اندر ایک نحیف و ناتواں شخص زمین پر اپنے بستر پر لیٹا اخبار پڑھتا دکھائی دیا۔مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ آخرِ کار میں اس شخص کو دیکھ رہا تھا جس کی تصویر میں نے کنیڈین ٹی وی کی سکرین پر دیکھی تھی۔شمشیر خان کو دیکھ کر جاوید اقبال اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب تم سے ملنے آئے ہیں۔''

''کون ڈاکٹر صاحب؟'' جاوید اقبال نے عجب بے اعتنائی سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' شمشیر خان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا'' باہر کافی دھوپ اور گرمی ہے۔اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی کرسی اور میز جاوید اقبال کی کوٹھڑی میں ہی لگوا دوں''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

جب میں جاوید اقبال کے سامنے آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا'' میرا نام ڈاکٹر سہیل ہے۔میں کنیڈا میں ایک ماہرِ نفسیات کے طور پر کام کرتا ہوں۔میں کنیڈا سے خاص طور پر آپ سے ملنے آیا ہوں۔میں نے ٹی وی، رسالوں اور اخباروں کی سب خبریں پڑھی اور سنی ہیں۔میرا یہ خیال ہے کہ حقیقت وہ نہیں جو ٹی وی پر دکھائی گئی ہے اور سچ وہ نہیں جو اخباروں میں چھپا ہے۔اس لئے میں آپ کی کہانی آپ کی زبانی سننے آیا ہوں''۔

کنیڈا کا نام سنتے ہی جاوید اقبال کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔پھر وہ مسکرایا

اور کہنے لگا ''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ اتنی دور سے میری کہانی سننے تشریف لائے ہیں۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ ساری دنیا میری کہانی سنے'' پھر اس نے تکیے کے نیچے سے ایک اخبار نکال کر دکھایا ''دیکھیں آج کے اخبار میں ایک خبر چھپی ہے کہ انگلینڈ میں ایک ادارہ میرے کیس کو کسی بین الاقوامی عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ میرے وکیل کی فیس بھی دینے کو تیار ہیں''۔ پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا' اپنی عینک کو ٹھیک کیا' اپنی گردن کے گرد تولئے کو کس کر باندھا اور بولا ''میں آپ کو شروع سے آخر تک ساری کہانی سناؤں گا۔ آپ جو بھی سوال پوچھیں گے ان کا سچ سچ جواب دوں گا۔ میں آپ کو مایوس نہیں بھیجوں گا۔''

مجھے اچانک اپنی نرس این کا جملہ یاد آیا ''اگر جاوید اقبال نے انٹرویو دینے سے انکار کر دیا تو...''

''میں آپ کی کہانی شروع سے سننا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اپنے خاندان اور بچپن کے بارے میں بتائیں؟'' میرے اندر کا ماہرِ نفسیات جاگ گیا تھا۔

''میں لاہور میں نشتر روڈ پر رام گلی نمبر 3 میں مکان نمبر 3 میں 1961 میں پیدا ہوا تھا۔ اس سڑک کا نام پہلے برانڈرتھ روڈ ہوا کرتا تھا۔ میرے والد محمد علی تھے تو تاجر لیکن ایک شاعر اور صوفی منش آدمی تھے۔ انہیں پیروں فقیروں سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر اوقات داتا دربار چلِا کاٹنے جایا کرتے تھے۔ میرے نانا بھی ایک درویش منش انسان تھے۔ میری والدہ زہرہ پروین ایک سادہ گھریلو خاتون تھیں۔ ان کے نو بچے تھے۔ میرے چار بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میرے امی اور ابو کو مجھ سے خاص لگاؤ تھا۔''

''اس خاص لگاؤ کی وجہ؟''

''وہ خاص لگاؤ ایک خاص واقعہ کی وجہ سے تھا جو اس وقت پیش آیا تھا جب میں دس سال کا تھا' پھر جاوید اقبال کافی دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا جیسے ماضی کی یادوں کی پگڈنڈی پر

بہت دور نکل گیا ہو۔ واپس لوٹا تو کہنے لگا ''مجھ سے بہت سے لوگوں نے انٹرویو لئے ہیں لیکن میں نے یہ واقعہ کسی کو نہیں سنایا۔ آپ چونکہ کنیڈا سے آئے ہیں اور میں نے آپ کو سب کچھ بتانے کا وعدہ کیا ہے اس لئے میں آپ کو وہ واقعہ سنائے دیتا ہوں''۔ میں اپنا کاغذ قلم لے کر تیار ہو گیا۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔

''مجھے وہ سہ پہر کبھی نہ بھولے گی'' وہ گویا ہوا ''جب میں اپنے گھر کی بالکنی پر کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا اور میرے ابو وضو کر رہے تھے۔

''ابو! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''بیٹا! کراچی سے ایک پیر صاحب آئے ہیں ان کی زیارت کرنے''

''میں بھی چلوں؟''

''اپنی ماما سے پوچھ لو۔ باہر سخت گرمی ہے۔'' اور میں بھاگا بھاگا ماما کے پاس گیا تھا''

''کیا میں ابو کے ساتھ جا سکتا ہوں؟'' میں نے منت کی تھی۔

''جا تو سکتے ہو لیکن بابا جی سے کہنا تمہارے لئے دعا کریں۔ بابا جی بڑے کرامتوں والے ہیں'' ماما کو بھی بابا جی سے بہت عقیدت تھی۔ جاتے ہوئے ماما نے میرے سر پر ایک ٹوپی بھی رکھ دی تھی تا کہ مجھے دھوپ نہ لگے۔

چنانچہ میں اپنے ابو کے ساتھ اس مزار پر پہنچ گیا جہاں بابا جی نے اپنے مریدوں سے خطاب کرنا تھا۔ وہاں سینکڑوں بچے' بوڑھے اور جوان بابا جی کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ میں لوگوں کے کندھوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف میں پہنچ گیا۔ میں کرامتوں والے بابا جی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بابا جی آئے اور میرے سامنے منبر پر بیٹھ گئے۔ ان کی داڑھی ان کے کپڑوں کی طرح لمبی اور سفید تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک اور دائیں

ہاتھ میں ایک سبز رنگ کی خوبصورت تسبیح تھی۔ میں اسے بار بار گھورتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں اسے اپنے گلے کا ہار بنالیتا۔ باباجی نے مجھے تسبیح کو گھورتے دیکھا تو مسکرا دیے۔ ان کی مسکراہٹ بھی ان کی تسبیح کی طرح دلپزیر تھی۔

باباجی نے ایک لمبی تقریر کی۔ مجھے ان کی زیادہ تر باتیں سمجھ تو نہ آرہی تھیں لیکن پھر بھی میں ان کے اندازِ خطابت سے بہت متاثر تھا۔ میں ابھی ان کی تسبیح کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ ان کی نگاہ دوبارہ مجھ پر پڑی اور وہ تقریر کرتے کرتے رک گئے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے

''یہ لڑکا کون ہے؟''

''جاوید اقبال'' کسی نے جواب دیا۔

''کس کا بیٹا ہے؟''

''محمد علی کا'' کسی مرید نے جواب دیا۔

''اگر محمد علی محفل میں موجود ہیں تو سامنے تشریف لائیں''

اور میرے ابو لوگوں کے کندھوں کو پھلانگتے سامنے آگئے اور مجھے باباجی کی خدمت میں پیش کیا۔ باباجی نے سب کے سامنے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور کہنے لگے ''محمد علی! میں تمہیں ایک خوشخبری دیتا ہوں۔ تمہارا بیٹا کسی اور دنیا کا باشندہ ہے۔ وہ برگزیدہ انسان ہے۔ اس کے ابروؤں کو دیکھو ان کے درمیان ایک ستارہ ہے۔ یہ ایک نشانی ہے' روحانی نشانی' عالمِ ارواح کی نشانی۔ یہ بڑا ہو کر ایک درویش' ایک صوفی' ایک ولی اللہ بنے گا۔ اس کے ہاتھوں سے لوگوں کو شفا ملے گی۔' پھر باباجی نے میرے سر پر سبز چادر ڈالی' کچھ پڑھا اور پھونک ماری۔ میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں تلاوتِ کلام پاک کر رہا تھا۔

باباجی کے مریدین یہ کرامت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ رخصت ہوتے وقت باباجی

نے ابو سے کہا ''اس کا خاص خیال رکھنا۔ یہ تمہارے لئے خدا کا تحفہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں شفا ہے''۔

بابا جی تو اگلے دن کراچی چلے گئے لیکن مجھ پر حال آنے بند نہ ہوئے۔ دور دور سے بابا جی کے مرید اپنے بیمار بچے لے کر میرے پاس آتے اور مجھ سے دعائیں کرواتے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے دعا مانگنے اور ان کے چہروں پر پانی چھڑکنے سے وہ شفایاب بھی ہو جاتے۔ میں جو پیشین گوئیاں کرتا وہ بھی درست نکلتیں۔ ان واقعات نے سب گھر والوں کو حیران پریشان کر رکھا تھا۔ وہ باتیں میرے لئے بھی ایک راز سے کم نہ تھیں۔

آہستہ آہستہ کرامات کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ میرا اسکول جانا بھی بند ہو گیا اور گھر کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ ہمارا گھر ایک سرائے بنتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن ماما نے ابو سے کہا ''محمد علی! جاوید اقبال کو دوبارہ بابا جی کے پاس کراچی لے جاؤ اور ان سے دعا کرواؤ کہ اسے حال آنے بند ہو جائیں''۔ جب ابو مجھے بابا جی کے پاس کراچی لے گئے تو بابا جی نے کہا ''محمد علی میں جانتا ہوں کہ تم کیوں آئے ہو۔ تم یہاں مزار پر دو دن رہو پھر جمعہ کی نماز کے بعد آنا''۔

میں اس مزار پر دوسرے مریدوں کے ساتھ رہا۔ مجھے ان کی قوالیوں کی محفلیں اتنی پسند آئیں کہ میرا جی چاہا کہ میں وہیں رہ جاؤں۔ دو دن بعد جب ابو مجھے لے کر بابا جی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ کہنے لگے ''محمد علی تم اپنے بیٹے کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ کسی اور ہی دنیا کا باسی ہے۔ خدا نے تمہیں نو بچے دئے ہیں'' تم ایک بچہ اسے واپس تحفے کے طور پر دے دو''۔

بابا جی کی باتیں سن کر ابو زار و قطار رونے لگے ''نہیں بابا جی میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کی ماما مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔''

اس کے بعد بابا جی جلال میں آ گئے اور کہنے لگے ''اچھا پھر اسے واپس لے جاؤ۔ میں

اسے اپنی سبز تسبیح پہنائے دیتا ہوں۔ جب تک یہ تسبیح اس کے گلے میں رہے گی اسے حال نہیں آئے گا۔لیکن محمد علی! جاوید اقبال کا خاص خیال رکھنا۔اسے دنیاوی کاموں اور شادی کے جھمیلوں میں نہ پھنسانا۔اسے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے دینا۔اگر کسی نے اس کا دل توڑا یا اس پر ظلم کیا تو اس کے دل سے ایک بددعا نکلے گی اور پورے خاندان اور پوری قوم پر عذاب آئے گا۔ایسا عذاب جو نوح اور لوط کی قوموں پر آیا تھا۔اس دن کے عذاب سے ڈرنا۔''

جب میں کراچی سے واپس لوٹا تو مجھے حال آنے بند ہو گئے اور میں دن رات باباجی کی سبز تسبیح پہننے لگا۔وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔اسے پہن کر مجھے عجیب طرح کا سکون ملتا تھا۔اس تسبیح میں شاید کوئی روحانی طاقت تھی جس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔مجھے باباجی کی یہ بات کبھی نہ بھولی کہ میں خدا کا تحفہ اور برگزیدہ انسان تھا۔

جاوید اقبال چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا' اس کے چہرے پر درد اور کرب کے تاثرات ابھرنے لگے لیکن پھر اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور وہ دوبارہ مسکرانے لگا۔

''میں سکول میں جو کام بھی کرتا اس میں کامیاب رہتا۔
میں نے تقریری مقابلوں میں حصہ لیا تو انعامات حاصل کئے
جب میں نے گانا شروع کیا تو میرے گانوں کو سب نے پسند کیا
جب میں نے پینٹ کرنا شروع کیا تو لوگ حیران پریشان رہ گئے
جب میں نے قرات شروع کی تو اساتذہ نے حوصلہ افزائی کی۔

میں سکول میں ایک کامیاب اور مقبول طالب علم سمجھا جاتا تھا لیکن میرا دل لکھنے میں تھا۔میں ایک جرنلسٹ بن کر قوم کا مستقبل سنوارنا چاہتا تھا۔میں نے سکول کے زمانے سے مضامین لکھنے شروع کر دئے تھے جو لاہور کے اخبار ''وقت'' میں چھپا کرتے تھے۔میں نے وہ مضامین سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔اگر آپ میری شاعرہ بہن یاسین یاس سے ملنے ۴۴ اشاد باغ جا سکے تو وہ آپ

کو وہ مضامین ضرور دکھائے گی۔اس نے میری پینٹنگز بھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔

''کیا آپ کے اساتذہ میں سے کسی نے آپ سے ظالمانہ سلوک کیا تھا؟''

''ہاں ایک استاد نے کیا تھا۔ ماسٹر ریاض نے۔وہ ایک موٹا' بدشکل اور ظالم استاد تھا۔وہ میرے بڑے بھائی اعجاز الحق کا بھی استاد رہ چکا تھا اور میرے بھائی کو بالکل پسند نہ کرتا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز کا بدلہ لے رہا ہو۔سب طالب علم اسے ناپسند کرتے تھے۔ہم اس سے ٹیوشن پڑھنے اس کے گھر بھی جاتے تھے لیکن وہ پھر بھی خوش نہ ہوتا تھا۔آخر سب طالب علم اس سے اتنے تنگ آ گئے کہ ایک دن جب کہ ہم اس کے کمرے میں سبق پڑھ رہے تھے میرے دوست بھولے نے اس کمرے کے دروازے پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ہم سب نے بھاگ کر جان بچائی۔ ماسٹر ریاض نے یہ کہتے ہوئے مجھے مورِدِ الزام ٹھہرایا کہ میں نے بھولے کو اکسایا تھا۔میں اس دن بہت غمزدہ تھا کیونکہ مجھ پر غلط الزام لگایا گیا تھا۔اس واقعہ کی وجہ سے مجھے بہت غصہ آیا اور میں تلخ ہو گیا۔جب امتحان کا وقت آیا تو میں نے ماسٹر ریاض کے دو مضامین کے علاوہ سب پرچے دیئے اور بہت اچھے نمبر حاصل کئے۔جب اساتذہ نے وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ میں نے وہ پرچے احتجاج کے طور پر نہیں دیئے۔جب اس واقعہ کی تحقیق کی گئی تو مجھے ایک خاص سرٹیفکیٹ دیا گیا اور ماسٹر ریاض کو بچوں پر ظلم کرنے کی وجہ سے نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ مجھے اس وقت سے اندازہ ہے کہ جو بھی مجھ پر ظلم کرتا ہے وہ خود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

سکول کے زمانے میں میرے بہت سے مشاغل تھے۔میں سکے اور ٹکٹیں جمع کیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک غیر معمولی لڑکا تھا۔ میں باقی بچوں کی طرح فٹ بال اور کرکٹ نہ کھیلتا تھا بلکہ اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔میں اپنے ہمسایوں کی بجائے سات سمندر پار انسانوں میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اسی لئے میری ساری دنیا کے لوگوں سے قلمی دوستیاں تھیں۔میں نے اپنے سعودی دوست زاہد کے ساتھ مل کر ایک رسالہ بھی شروع کیا تھا جس کا نام ہم نے ''جاوید

انٹرنیشنل'' رکھا تھا۔اس رسالے میں ہم اپنے تمام قلمی دوستوں کے نام اور پتے شائع کرتے تھے۔ مجھے ایسے کام کر کے بہت خوشی ہوتی تھی۔

مسلم ہائی سکول کے امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے ریلوے روڈ کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب میں نے عالمی مذاہب میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میں نے فیصل آباد کے ایک ادارے میں داخلہ بھی لیا تھا اور تورات' زبور' انجیل اور قرآن کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا شروع کیا تھا۔ میں نے اس مذہبی ادارے کے امتحان دے کر سرٹیفکیٹ بھی حاصل کئے تھے۔

''آپ کی تعلیم کا سلسلہ کیسے منقطع ہوا؟''

''کالج کے زمانے میں میں سیاست میں ملوث ہو گیا۔ بھٹو کے دور میں میں نے ایک جلوس میں شرکت کی اور ہمارا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور بہت سے طالب علم زخمی ہو گئے۔ مجھے اتنا مارا پیٹا گیا کہ میں کچھ عرصہ ہسپتال میں رہا۔ جب ہسپتال سے نکلا تو اپنی پڑھائی کو قائم نہ رکھ سکا اور بزنس شروع کر دیا۔''

ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے اور میں جاوید اقبال کی کہانی بڑے غور وخوض سے سن رہا تھا کہ اتنے میں ایک سپاہی کھانا لے کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سالن کی بالٹی تھی اور دوسرے میں روٹیاں۔

''کیا آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے؟'' جاوید اقبال نے ایک میزبان بن کر پوچھا۔

''نہیں شکریہ''

''میرا کھانا ساتھ والے کمرے میں ساجد کے پاس رکھ دو۔ میں بعد میں کھا لوں گا'' جاوید اقبال نے سخت لہجے میں سپاہی سے کہا۔ (ساجد وہ لڑکا تھا جس پر جاوید اقبال کے ساتھ 98 لڑکوں کے قتل کا الزام تھا)۔ سپاہی سے فارغ ہونے کے بعد جاوید اقبال نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے

اگلے سوال کا انتظار کر رہا ہو۔

''اپنی شادیوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''میں نے اپنے خاندان کے دباؤ میں آ کر دو شادیاں کیں۔ دونوں بری طرح ناکام رہیں۔ بابا جی نے میرے ابو سے کہا تھا کہ مجھے شادی کے جھمیلوں میں نہ ڈالیں لیکن میرے ابو نے ان کی بات پر عمل نہ کیا۔ اسی لئے بہت عذاب آیا۔ میرا دونوں شادیوں سے ایک ایک بچہ ہے لیکن میری اپنی بیویوں اور بچوں سے کئی سالوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔

گفتگو کرتے کرتے اچانک جاوید اقبال خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر درد اور کرب کے آثار نمودار ہوئے ''میں بہت تکلیف میں ہوں۔ اذیت میں ہوں۔ ان ظالموں نے مجھے اتنا مارا پیٹا کہ میں بائیس دن ہسپتال میں بیہوش پڑا رہا۔ انہوں نے تو مجھے قتل کر دیا تھا لیکن میں زندہ رہا۔ میرا زندہ رہنا ایک معجزہ ہے۔ لیکن اب میں ایک مردہ انسان ہوں۔ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ جیل والے آدھا گھنٹا دیتے ہیں تو میں ساجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا سہارا لے کر چلتا ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔

مجھے بیساکھیوں کی ضرورت ہے۔ پھر اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہنے لگا

''مجھے اپنا ہاتھ دیں''

میرے لئے یہ دعوت بالکل غیر متوقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک ایسے انسان کے سامنے بیٹھا ہوں جس پر سو بچوں کو قتل کرنے کا الزام ہے اور سپاہی بھی نظروں سے اوجھل تھے۔ ''کیا میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں؟'' میں نے اپنے دل سے پوچھا۔ ''اگر تم نے ہاتھ نہ دیا تو اس کے اعتماد کو ٹھیس لگے گی اور وہ تمہیں باقی آپ بیتی نہیں سنائے گا''۔ پھر اچانک مجھے Silence of the Lambs فلم یاد آ گئی جس میں ایکٹر Anthony Hopkins ایک سیریل قاتل کا کردار ادا کرتا ہے اور جب ایک سپاہی اس سے ہاتھ ملاتا ہے تو وہ اسے قتل کر

دیتا ہے۔

''کیا جاوید اقبال مجھے نقصان پہنچائے گا؟''

''نہیں' میرے دل نے کہا اور میں نے اپنا ہاتھ ایک سیریل قاتل کے ہاتھ میں دے دیا۔اس نے میرا ہاتھ پکڑا' میری شہادت کی انگلی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے اپنا ماتھا' اپنا جبڑا اور چہرا چھونے لگا۔اس کی ہڈیاں کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ہڈیوں کو چھونے کے بعد اس نے چند لمحے میرا ہاتھ پکڑے رکھا پھر چھوڑ دیا۔اس نے کوئی غیر مہذب حرکت نہیں کی لیکن میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یا تو وہ گے Gay ہے اور یا انسانی لمس کو ترسا ہوا ہے۔

''انہوں نے مجھے قتل کر دیا تھا لیکن میں ابھی بھی زندہ ہوں۔وہ مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ انسان کا سب چیزوں پر اختیار ہے دو چیزوں پر اختیار نہیں ہے۔پیدائش اور موت۔یہ دونوں خدا کے اختیار میں ہیں۔

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''انہوں نے مجھے انٹرویو کے لئے صرف ایک گھنٹہ دیا اور ابھی آپ کی آپ بیتی ادھوری ہے''

''ڈاکٹر صاحب گھبراتے کیوں ہیں'' اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔''میں نے سپاہیوں سے کہہ رکھا ہے میرے ساتھ زیادہ بدمعاشی نہ کریں۔میں تو ٹوٹا ہوا آدمی ہوں۔میرا کیا ہے میں اس کوٹھڑی کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جاؤں گا اور انہیں ساری دنیا کو جواب دینا پڑے گا۔اس لئے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔آپ سوال پوچھتے رہیں میں جواب دیتا رہوں گا۔ آپ اتنی دور سے آئے ہیں۔میں آپ کو مایوس نہیں بھیجوں گا''۔

اس لمحے مجھے اپنے چچا عارف عبدالمتین کا شعر یاد آیا

؎ اپنی کہتے رہو' میری سنتے رہو' داستاں داستاں سے ملاتے رہو

یونہی جلتے رہیں درد کے قمقمے' رات جب تک رہے درمیاں دوستو

''اپنے کاروبار کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''میں آٹھ سال تک ایک فیکٹری چلاتا رہا۔ میں لوہے کی نالیاں بیچا کرتا تھا۔صوبہ سرحد کے پٹھان آ کر خریدا کرتے تھے۔میں ایک میگزین بھی نکالا کرتا تھا جو کرپشن کے خلاف تھا۔ مجھے لوگ اپنی کہانیاں سنایا کرتے تھے اور میں انہیں چھاپتا تھا۔ میں نے بہت سے گھر سے بھاگے ہوئے بچوں کی کہانیاں چھاپی تھیں۔ میں پولیس پر بہت تنقیدی مضامین لکھا کرتا تھا۔

''کیا آپ کو کبھی غیر معمولی تجربات ہوئے۔کیا آپ نے کوئی ایسی چیزیں دیکھیں یا سنیں جو بعد میں پتہ چلا کہ آپ کا وہم تھیں؟'' میرے اندر کا ماہرِ نفسیات اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

''ہاں۔کسی نے مجھ پر کالا جادو کر دیا تھا۔ایک رات میں خوفزدہ ہو کر جاگ گیا تھا۔ جب میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے درختوں کے پتوں کی شریانیں صاف دکھائی دیں۔پھر مجھے درخت سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ مجھے چند دن تک دھواں دکھائی دیتا رہا اور پھر وہ غائب ہو گیا۔ میرا خیال ہے مجھ پر میری ساس نے کالا جادو کیا تھا۔میرے سسرال نے مجھے کبھی پسند نہ کیا تھا۔''

جب میں نے کوٹھڑی سے باہر دیکھا تو مجھے سپاہی نظر آیا۔ میرا گھنٹہ ختم ہو چکا تھا۔

''کیا میں دوبارہ آ سکتا ہوں؟'' میں نے جاوید اقبال سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ ضرور تشریف لائیں۔اور اگر آپ میرے مضامین اور پینٹنگز دیکھنا چاہتے ہیں تو میری بہن یاسین یاس سے جا کر ملیں جو 144 شادباغ لاہور میں رہتی ہے۔آپ کا کنیڈا سے مجھ سے ملنے آنے کا بہت بہت شکریہ''۔

میں سپاہی کے ساتھ واپس ویٹنگ روم میں آیا تو شعیب میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں اور شعیب جیل سے رخصت ہونے لگے تو میں نے شمشیر خان کا شکریہ ادا کیا اور

پوچھا ''کیا آپ میرا خط مجھے واپس دے سکتے ہیں؟''

''کون سا خط؟''

''وزیر کا خط جو میں نے سپریٹنڈنٹ صاحب کو دیا تھا۔''

''لیکن وہ تو ہماری فائل میں محفوظ ہو گیا ہے۔''

''مجھے اس کی ایک کاپی چاہئے۔''

''کس لئے؟''

''اپنی فائل کے لئے۔''

''لیکن میں آپ کو اس کی کاپی نہیں دے سکتا۔''

''کیوں نہیں؟''

''ہمارے پاس فوٹو کاپی مشین نہیں ہے۔''

اور ہم دونوں چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں جو اپنے کنیڈا کے کلینک میں فون، فوٹو کاپی اور ای میل e-mail کی سہولتوں کا عادی تھا یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ دنیا کے کسی ملک میں ایک ایسی جیل بھی ہو سکتی ہے جس میں قیدی تو دو ہزار سے زیادہ ہوں لیکن فوٹو کاپی مشین ایک بھی نہ ہو۔

''ڈاکٹر صاحب! میں ایک کام کر سکتا ہوں''

''وہ کیا؟''

''میں آپ کے ساتھ اپنے پولیس افسر الف خان کو بھیج سکتا ہوں جو قریبی مارکٹ سے آپ کے خط کی فوٹو کاپی کروا کے لا سکتا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ''

شعیب مجھے اور الف خان کو گاڑی میں بٹھا کر بازار لے جا رہا تھا تو میں نے کہا ''شعیب میاں!

میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا''۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں محظوظ ہوتا رہا''۔

''کس چیز سے؟''

''اس دوران قیدیوں سے ان کے مہمان ملنے آئے تھے۔قیدی جالی کے اندر تھے اور مہمان باہر۔ یوں لگ رہا تھا قیدی پنجرے میں بند ہوں' پھر شعیب نے الف خان سے پوچھا ''مجھے ایک بات بتائیں۔''

''وہ کیا؟''

''اس کی کیا وجہ تھی کہ بعض مہمانوں کو صرف آدھ گھنٹے کی اجازت تھی اور بعض مہمان پورا ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے''۔

الف خان پہلے تو چند لمحے خاموش رہا پھر بولا ''سچی بات بتاؤں؟''

''ضرور بتائیں''

''اجازت تو صرف آدھ گھنٹے کی ہوتی ہے لیکن اگر مہمان پولیس افسر کو سو روپے دے دیں تو وہ آدھ گھنٹہ اور رک سکتے ہیں''۔

''پھر تو اس پولیس افسر کے وارے نیارے ہو جاتے ہونگے''۔

''جی ہاں۔اسی لئے ہر پولیس افسر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی ڈیوٹی وہاں لگے تاکہ اس کی دو تین ہزار روپے کی کمائی ہو جائے''۔

''کیا اسی کو ھذا من فضلِ ربی کہتے ہیں؟''۔

اور ہم تینوں زور زور سے ہنس دیے۔

==========

آٹھواں باب ... کالے ڈبے کا جادو اور پاکستانی سیاست

جب ہم الف خان کو واپس پہنچا کر جیل کی گھٹی فضا سے باہر نکلے تو شعیب نے پوچھا ''سہیل بھائی! تو پھر جاوید اقبال کو انٹرویو کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟''

''بہت ہی غیر معمولی۔''

''آپکا پہلا تاثر کیا تھا؟''

''مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنا بیمار اور کمزور ہے۔اس سے تو ٹھیک طرح سے چلا تک نہیں جاتا۔ وہ بالکل ٹوٹا ہوا آدمی لگتا ہے جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔''

''آپ کو اس سے ڈر تو نہیں لگا؟''

''نہیں۔لیکن ایک موقع پر میں چند لمحوں کے لئے پریشان ہو گیا تھا۔''

''وہ کس طرح؟''

''انٹرویو دیتے ہوئے اچانک کہنے لگا'' ڈاکٹر صاحب! اپنا ہاتھ پکڑائیں' میں پہلے تو ذرا خوفزدہ ہوا اور سوچنے لگا کہ آخر وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے۔اس وقت سپاہی بھی میرے سامنے نہ تھا۔ وہ مجھے جاوید اقبال کی کوٹھری میں چھوڑ کر کسی اور قیدی کو دیکھنے چلا گیا تھا۔اس لمحے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا'' کیا وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟'' اور جب میرے من نے جواب نفی میں دیا تو میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرا امتحان لے رہا ہو اور جاننا چاہتا ہو کہ میں اس پر کتنا اعتماد کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر میں نے اس کے ساتھ تعاون نہ کیا تو پھر وہ بھی میرے ساتھ تعاون نہ کرے گا۔اس نے میری شہادت کی انگلی سے اپنے سر اور چہرے کے ان حصوں کو چھوا جہاں اس کی

ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں لیکن پھر اس نے مجھے ایک surprise دیا۔''

''وہ کیا؟''

''اس نے میرے ہاتھ کو فوراً نہیں چھوڑا۔

He lingered for a few seconds. His touch was not sexual but it was sensual.

اس کی اس حرکت سے مجھے ایک خیال آیا''۔

''وہ کیا؟''

''کہیں جاوید اقبال gay تو نہیں ہے؟''

''تو کیا آپ کا انٹرویو پورا ہو گیا ہے؟''

''نہیں مجھے ایک دفعہ پھر آنا ہو گا۔ اور اب مجھے بھوک لگی ہے۔ کہیں کھانا کھلاؤ۔''

چنانچہ شعیب مجھے ایک نان کباب کی دکان پر لے گیا۔ مجھے کوک پیتے ہوئے میز پر ایک اخبار نظر آیا جس کی سرخی تھی

''نواز شریف کو دو دفعہ عمر قید کی سزا ملی ہے۔''

''اب تو اس کا سیاسی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ کیا اسی سزا کی توقع تھی؟''

''لوگوں کا تو خیال تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں''

''میں سمجھا نہیں''

''لوگوں کا خیال تھا کہ جس طرح ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کو سولی پر چڑھایا تھا اسی طرح پرویز مشرف بھی وزیرِ اعظم نواز شریف کو پھانسی کی سزا دلوا دے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا''۔

''نواز شریف پر الزام کیا تھا؟''

''دراصل کہانی یہ تھی کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کی جائے یا نہیں۔نواز شریف اور پرویز مشرف میں اس بات پر اختلاف تھا اس لئے جب پرویز مشرف سری لنکا میں تھا تو نواز شریف نے اسے برطرف کر دیا۔نواز شریف پر الزام یہ تھا کہ وہ اس جہاز کے سینکڑوں مسافروں کو،جس میں پرویز مشرف سری لنکا سے واپس آ رہا تھا،قتل کرنا چاہتا تھا۔''

''لیکن یہ الزام ثابت کیسے ہوا؟''

''جہاں اور کچھ کام نہیں آتا وہاں کالے ڈبے کام آتے ہیں۔جب جہاز کے بلیک باکس Black Box کے رازوں کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تو ثابت ہوا کہ جہاز کے پائلٹ نے صاف کہا تھا کہ اس کے پاس صرف سات منٹ کا ایندھن باقی ہے لیکن اس کے باوجود کنٹرول ٹاور نے کہا کہ نواز شریف کے احکامات ہیں کہ پرویز مشرف کو برطرف کر دیا گیا ہے اور اس کے جہاز کو ائر پورٹ پر اترنے کی اجازت نہیں ہے''۔

''یہ بلیک باکس تو زبردست چیز ہے۔ہر شخص اور ہر قوم کی زندگی میں ایک بلیک باکس ہوتا ہے جو بہت سے رازوں کو اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے''۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہر انسان کا بلیک باکس اس کا لاشعور ہوتا ہے جو راتوں کو کھلتا ہے اور اپنے رازوں کو خوابوں میں بکھیر دیتا ہے اور ہر قوم کا بلیک باکس تاریخ کی کتابوں میں اپنے راز بے نقاب کرتا ہے''۔

''اس کی مثالیں؟''

''امریکہ میں کنیڈی کی موت اور پاکستان کی تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ اور ضیاء الحق کی موت۔''

''لیکن ضیاء الحق کے جہاز کے بلیک باکس کے راز ابھی تک فاش نہیں ہوئے''۔

''وقت آنے پر فاش ہو جائیں گے جیسے بنگلہ دیش کے راز حمود الرحمٰن رپورٹ کے چھپنے سے سامنے آئے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم پرویز مشرف کے حق میں کیوں ہو؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ وہ لبرل' سیکولر اور دیانتدار لیڈر رہے اور دوسری وجہ یہ کہ نواز شریف ایک کرپٹ وزیرِ اعظم تھا۔''

''لیکن آیا تو عوام کی پسند سے تھا''۔

''لیکن اس کے اعصاب پر اسلام سوار ہونے لگا تھا اور وہ بھی افغانستان کے طالبان کی طرح پاکستان میں اسلامی شریعت نافذ کرنا چاہتا تھا۔''

''آپ کس کے ہاتھ میں قوم کے مستقبل کی باگ ڈور دینا چاہتے ہیں؟''

''بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں''

''وہ کیوں؟''

''وہ اپنے باپ کی طرح ایک جمہوریت پسند عورت ہے''۔

''لیکن سچی بات یہ ہے کہ پاکستان میں مذہبی قوانین کی روایت بھٹو نے ہی شروع کی تھی''۔

''وہ کس طرح؟''

''پہلے اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کا اعلان کیا' پھر شراب کو غیر قانونی قرار دیا اور آخر میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ پاکستان میں جمہوریت قائم ہی نہیں ہو سکتی''۔

''اس کی وجہ؟''

''کیونکہ وہ ایک مذہبی ریاست ہے اور جمہوریت کا پودا مذہب کے سائے میں کبھی نہیں پنپ سکتا۔ جمہوریت کے لئے مکالمے dialogue کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذہبی فضا میں تبلیغ زیادہ ہوتی ہے مکالمہ کم؟''

’’تو پھر اس کے لئے کس قسم کی فضا کی ضرورت ہے؟‘‘

’’سیکولر فضا کی۔ایسی فضا کی جہاں مردوں اور عورتوں کو‘ اقلیتوں اور اکثریت کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ جہاں ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کیا جائے اور لوگ رنگ‘نسل‘ زبان اور مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہو کر آپس میں مل جل کر مسائل کا حل تلاش کریں۔جب تک پاکستان ایک اسلامی ریاست رہے گا اس میں جمہوریت‘ سوشلزم اور سیکولرازم نہیں پنپ سکتے‘‘۔

’’سہیل بھائی ! آپ تو ایک Idealist ہیں۔ میں ایک Realist ہوں۔آپ تو خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں‘‘۔

’’اگر ہم خواب نہ دیکھیں گے تو پھر وہ شرمندۂ تعبیر کیسے ہوں گے؟‘‘

==========

نواں باب ... پرویز اقبال (بڑے بھائی) سے انٹرویو

اگلی صبح میں نے اور شعیب نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنے دوست کو فون کیا تا کہ شاد باغ کا راستہ معلوم کر سکے۔ شعیب اس علاقے سے ناواقف تھا۔ شاد باغ جاتے ہوئے ہم چمڑا منڈی سے گزرے جہاں ہمیں ہزاروں لوگ گائے کی کھالوں کو صاف کرتے دکھائی دیے۔ شعیب کہنے لگا کہ یہ کھالیں ساری دنیا میں بھیجی جاتی ہیں۔

''لیکن یہ کھالیں آتی کہاں سے ہیں؟'' میں نے شعیب سے پوچھا۔

''مسلمان گوشت سے محبت کرتے ہیں۔ عید پر جب ہزاروں گائیں اور دنبے قربان ہوتے ہیں تو ان کی کھالیں مسجدوں میں بھیج دی جاتی ہیں تا کہ ان سے غریبوں کی مدد ہو سکے اور وہ کھالیں مسجدوں سے چمڑا منڈی میں پہنچ جاتی ہیں۔''

''یہ تو شکر کی بات ہے کہ یہاں ہندو نہیں رہتے ورنہ یہاں ہر روز تیسری عالمی جنگ کا منظر ہوتا''۔

ہم پرانے لاہور سے گزرے جہاں گلیاں بھیڑ اور گرد سے بھری ہوئی تھیں۔ کوئی بھی ٹریفک کے قوانین کی پرواہ نہ کر رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہو رہی تھی کہ میں پاکستان آنے کے بعد چند دنوں میں ہی گندی گلیوں اور ناصاف ہوا کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پاکستان سے کبھی گیا ہی نہ تھا۔ ویسے میں کنیڈا میں بھی سگریٹ کے دھوئیں سے پرہیز نہ کرتا تھا کیونکہ میرا ایمان تھا کہ آلائشیں زندگی کا حصہ ہیں ہمیں ان کا عادی ہونا چاہیے۔ وہ پاکستانی جو کنیڈا میں حد سے زیادہ صفائی کا خیال رکھتے ہیں ان میں سے بہت سے پاکستان آکر بیمار ہو جاتے ہیں اور ان کے بچوں کو علاج کروانے چند دن ہسپتال میں گزارنے پڑتے ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر ساری دنیا عالمی گاؤں بنتی جا رہی ہے تو ہمیں عالمی شخصیتوں والے

لوگ چاہئیں جو مختلف ممالک اور ثقافتوں میں آرام اور سکون سے زندگی گزار سکیں۔ میں اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ شعیب نے پوچھا۔

''جاوید اقبال نے آپ کو کیا پتہ بتایا تھا؟''

''144 شاد باغ''

شعیب کو وہ گلی مل گئی اور اس نے ایک طرف گاڑی پارک کر دی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ پاکستان میں لوگ جہاں چاہتے ہیں گاڑی پارک کر دیتے ہیں۔ اگر کنیڈا میں کوئی ایسا کرے تو پولیس گاڑی اٹھا کر لے جاتی ہے۔

جب ہم گلی میں داخل ہوئے تو ہمیں حیرانی ہوئی کہ وہاں تین گھر تھے۔ 144 اے، 144 بی اور 144 سی۔ میں نے 144 بی کی گھنٹی بجائی تو ایک نوجوان نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

''میں ڈاکٹر سہیل ہوں اور میں شاعرہ یاسین یاس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کوئی یاسین یاس نہیں رہتی۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا اس نے دروازہ بند کر دیا۔

میں نے شعیب کی طرف دیکھا۔ اس نے دوسرے دو گھروں سے پوچھا لیکن اسے بھی ناکامی ہوئی۔ ہمیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ میں اور شعیب گلی کے کونے پر کھڑے اس صورتِ حال پر غور کر رہے تھے کہ 144 اے سے ایک برقعہ پوش خاتون نکلی اور ہمارے قریب آ کر پوچھنے لگی۔

''آپ کس یاسین یاس کو تلاش کر رہے ہیں؟''

''وہ ایک شاعرہ ہیں اور جاوید اقبال کی بہن ہیں۔ وہی جاوید اقبال جس پر سو بچوں کے قتل کا الزام ہے''۔ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔آپ جاوید اقبال کے خاندان کی تلاش میں ہیں۔آپ دراصل غلط شادباغ میں ہیں۔اب لاہور میں دوشادباغ ہیں۔ پرانا اور نیا۔آپ یہاں سے سیدھا چلے جائیں اور سڑک کے آخر میں بائیں طرف مڑ جائیں وہاں آپ کو ایک مارکٹ ملے گی ۔جاوید اقبال کا خاندان وہاں رہتا ہے۔وہ نیا شادباغ ہے۔''

ہم نے اس خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کی ھدایات پر عمل کرتے ہوئے نئے شادباغ کی مارکٹ میں پہنچ گئے ۔ہم اندر گئے تو مجھے ایک داڑھی والا نوجوان نظر آیا۔ میں نے اس سے جاوید اقبال کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا

''اور آپ کون ہیں اور ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میرا نام ڈاکٹر سہیل ہے۔میں کنیڈا میں ایک ماہرِ نفسیات کے طور پر کام کرتا ہوں۔ مجھے جاوید اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ میں اس کے خاندان سے ملوں۔اسی نے مجھے پتہ دیا ہے''۔

''میرا نام سعید ہے'' وہ نوجوان بولا ''میں جاوید اقبال کا چھوٹا بھائی ہوں۔لیکن آپ کی جاوید اقبال سے ملاقات کہاں ہوئی؟'' وہ کچھ حیران دکھائی دے رہا تھا۔

''میں کوٹ لکھپت جیل میں اس کا انٹرویو لے کر آیا ہوں''۔

سعید ہمیں دکان کے قریب ہی ایک خالی کمرے میں لے گیا۔ہمیں احترام سے کرسیوں پر بٹھایا اور کہنے لگا ''آپ یہاں انتظار کریں میں اپنے خاندان کو مطلع کرتا ہوں۔''

ہم کافی دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن سعید لوٹ کر نہ آیا۔ میں سوچتا رہا کہ ان کا خاندان کتنی آزمائشوں سے گزرا ہوگا۔نجانے کتنے جرنلسٹ ان کا انٹرویو لینے آئے ہونگے اور وہ میرے بارے میں بھی سوچ رہے ہونگے کہ آخر میں کیا سوچ کر آیا ہوں۔لیکن پھر میں نے سعید کو آتے دیکھا اس نے میرا اپنے بھائی' بہن اور بھتیجے سے تعارف کروایا۔انہوں نے ہمیں جوس کا گلاس پیش کیا اور بڑے احترام سے ملے۔ میں ان کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔

میں نے پرویز اقبال کی طرف دیکھا جو چھوٹی مونچھوں والے ایک دراز قد انسان تھا اور کہا

''میں کنیڈا سے جاوید اقبال اور اس کے خاندان کا انٹرویو لینے آیا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اخباروں کی کہانی کے پیچھے ایک اور کہانی چھپی ہے۔ میں اس سچی کہانی کو تلاش کرنے آیا ہوں اور آپ اس میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے مجھ سے تعاون کیا تو میں بہت مشکور ہوں گا۔''

''آپ اتنی دور سے تشریف لائے ہیں۔ ہم ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ ہمیں بھی یہ احساس ہے کہ اخباروں میں ہمارے خاندان کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ہم بھی اپنی کہانی سنانا چاہتے ہیں۔ میں کہاں سے شروع کروں؟'' پرویز اقبال نے پوچھا۔

''آپ اپنے خاندان کے بزرگوں کے بارے میں بتائیں''

''ہمارا تعلق ایک مذہبی خاندان سے ہے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں تھے۔ وہ بہت روحانی لوگ تھے۔ ہمارے والد صاحب بہت محنتی انسان تھے۔ وہ حق حلال کی کمائی کھاتے تھے۔ کبھی حرام کا پیسا نہیں کھایا۔ اسی لئے خدا ان پر مہربان رہا۔ بعض دفعہ وہ چوبیس چوبیس گھنٹے لگاتار کام کرتے تھے اور صرف چند گھنٹے سوتے تھے۔ میرے دادا اور پردادا کا تعلق جالندھر سے تھا۔ ایک زمانے میں وہ کافی مالدار ہوا کرتے تھے لیکن پھر وہ اپنی دولت کھو بیٹھے۔ ہمارا تعلق مغل خاندان سے ہے۔ مغل خاندان کا المیہ یہ رہا ہے کہ پہلے انگریزوں نے اور پھر ہندوؤں نے انہیں دبانے کی کوشش کی کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے مغل تعلیم سے محروم رہے۔ ہمارے خاندان نے پہلے کچھ تعلیم حاصل کی اور پھر لوہے کے کاروبار میں مصروف ہو گئے تاکہ عزت کی روزی روٹی کما سکیں۔

روحانی حوالے سے ہمارا تعلق چشتی صابری روایت سے ہے۔ ہمارے نانا کی ایک

درگاہ ہوا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں جاوید اقبال وہاں عبادت اور ریاضت کرنے جایا کرتا تھا۔ میری والدہ کا اسی نیک اور پرہیزگار خاندان سے تعلق تھا۔ ہمارے خاندان میں کسی قسم کی بے حیائی اور بے شرمی کی روایت نہیں ہے۔

''مجھے اپنے والد اور ان کی شادیوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''جب میرے والد کی پہلی شادی ہوئی تو ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے میری والدہ سے شادی کی اور پھر بھی ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ پھر کسی بزرگ کے کہنے پر انہوں نے ایک بچے کو گود لے لیا۔ پھر ایک کرامت ہوئی' جسے اکثر لوگ نہیں مانیں گے' اور ان کے ہاں اپنے بچے پیدا ہوئے۔ ہوا یہ کہ ہمارے ہاں ایک بزرگ سائیں رکن الدین تشریف لائے' جن کا جڑانوالہ میں مزار تھا۔ میرے والد صاحب نے انہیں پھلوں کی ایک ٹوکری پیش کی۔ انہوں نے ٹوکری میں سے ایک مالٹا لے کر میری اماں کو پیش کیا اور کہا کہ اس کو چھیل کر اس کی پھانکیں گنیں۔ اس کی نو پھانکیں تھیں۔ بزرگ فرمانے لگے'' آپ کے ہاں نو بچے ہوں گے''۔ اور ہوا بھی ایسے ہی۔ میرے اماں اور ابو کے ہاں نو بچے ہوئے اور بزرگ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ میری اس بزرگ سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ہم نے یہ کہانی اپنی اماں سے سنی ہے۔

جاوید اقبال کے ساتھ بھی ایک کرامت ہوئی جب وہ تقریباً دس سال کا تھا۔ وہ ان دنوں سکول میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ جب کراچی سے ایک باباجی تشریف لائے اور جاوید اقبال ایک محفل میں ان سے ملا تو انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ پھر باباجی نے اس پر سبز چادر ڈالی تو وہ ہوش میں آ گیا۔ باباجی نے میرے ابو سے کہا کہ اس بچے میں روحانی طاقتیں ہیں۔ باباجی تو چلے گئے لیکن لوگ جاوید اقبال کے پاس بیمار بچے لاتے اور وہ انہیں ٹھیک کر دیتا۔ اس کی پیشین گوئیاں بھی صحیح ثابت ہوتیں۔ میں نے یہ سب کچھ

دیکھا لیکن ہم نے ان واقعات کو زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ اس وقت ہم بچے تھے۔ باباجی کے کراچی جانے کے بعد جب جاوید اقبال پر حال آتے رہے تو والدین بہت پریشان ہوئے۔ ہم بچے تھے ہمارا خیال تھا کہ وہ سکول نہ جانے کے بہانے بناتا ہے۔ ہم حقیقت سے بالکل بے خبر تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ڈرامے کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ابو کو احساس ہوا کہ جاوید اقبال ایک مسئلہ بنتا جا رہا ہے چنانچہ چند مہینوں کے بعد وہ اسے باباجی کے پاس کراچی لے گئے۔

ابو نے ہمیں بتایا کہ میں نے باباجی سے کہا کہ جاوید اقبال سارے خاندان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ باباجی کہنے لگے خدا نے تمہیں اتنے بچے دئے ہیں تم ایک بچہ خدا کی راہ میں قربان کر دو اور جاوید اقبال کو اس درگاہ پر چھوڑ جاؤ۔ ابو نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ایک عام انسان ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا جاوید اقبال بھی ایک عام انسانوں کی طرح زندگی گزارے۔

یہ سننا تھا کہ باباجی جلال میں آ گئے اور کہنے لگے ''اگر جاوید اقبال ہمارا نہیں بنے گا تو تمہارا بھی نہیں بنے گا۔'' باباجی نے یہ اہم الفاظ کہے۔

جب جاوید اقبال کراچی سے لوٹا تو ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس پر حال آنے بند ہو گئے اور اس نے سکول کی پڑھائی دوبارہ شروع کر دی۔ وہ بہت ذہین اور تخلیقی ذہن رکھنے والا بچہ تھا۔ وہ اخباروں میں کالم لکھتا تھا اور تقریری مقابلوں میں انعام حاصل کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت کامیاب طالبعلم سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں ہم بڑانڈرتھ روڈ کی رام گلی نمبر 3 میں رہتے تھے اور جاوید اقبال مسلم ہائی سکول نمبر 1 جایا کرتا تھا۔

ہمارے ابو کا فلسفہ یہ تھا کہ جب بچے جوان ہوں تو ان کی شادی کر دینی چاہئے تا کہ وہ کسی قسم کے مسئلے کا شکار نہ ہوں۔ چنانچہ انہوں نے میرے دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی اکٹھے کر دی۔ ابو نے ان کی رہائش اور کاروبار کا انتظام کیا تا کہ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس وقت میرے دونوں بھائیوں کی عمر سترہ اور اٹھارہ برس تھی۔ جاوید اقبال ان دنوں صرف تیرہ

برس کا تھا۔ جب بڑے بھائیوں کی شادی ہوگئی اور وہ گھر سے چلے گئے تو جاوید اقبال کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ رہا۔اس سے اگلے سال میری بھی شادی ہوگئی اور میں بھی آبائی گھر کو چھوڑ کر شاد باغ منتقل ہوگیا۔میں نے وہاں ایک ورکشاپ کھول لی اور نالیوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ابو نے کہا کہ میں جاوید اقبال کو کاروبار کے بارے میں کچھ سکھاؤں اس نے کچھ عرصہ میرے ساتھ کام بھی کیا لیکن پھر ہمارے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ میں نے جب اس کا ذکر ابو سے کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں ورکشاپ جاوید اقبال کے حوالے کر دوں اور خود بڑا انڈر تھ روڈ کا کاروبار سنبھال لوں۔

جب میں بڑا انڈر تھ روڈ منتقل ہوگیا تو میں اپنے نئے کاروبار اور خاندان میں مصروف ہو گیا اور میرا تعلق جاوید اقبال سے منقطع ہوگیا۔بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جاوید اقبال مسائل کا شکار ہوگیا ہے۔ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے مسائل ہیں۔ہم سب جانتے ہیں کہ مسجدوں میں کس طرح چھوٹے بچوں کا استحصال ہوتا ہے اور لوگ کس طرح جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ جاوید اقبال بھی آہستہ آہستہ جرائم پیشہ ماحول کا حصہ بنتا چلا گیا اور اس پورے عمل میں اس کی ناکام شادی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

”مجھے جاوید اقبال کی پہلی شادی کے بارے میں کچھ بتائیں۔اس وقت اس کی عمر کیا تھی اور حالات کس قسم کے تھا؟“

”جب جاوید اقبال کی پہلی شادی ہوئی وہ سترہ سال کا تھا۔وہ نوجوان تھا۔خوبرو تھا۔ کامیاب بزنس مین تھا اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔معاشرے میں لوگ اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ غریبوں کی مدد کرتا تھا۔وہ بزنس ایسوسی ایشن میں بھی فعال تھا۔ایک خاندان کو وہ پسند آ گیا۔انہوں نے اس سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات کی اور وہ راضی ہو گیا۔اس رشتے پر ہمارا خاندان راضی نہ ہوا۔ہمارے خاندان کے بزرگ چاہتے تھے کہ اس کی

شادی مغل خاندان میں ہو جبکہ ان کا تعلق چشتی خاندان سے تھا۔ جب ہمارے خاندان والوں نے جاوید اقبال سے کہا کہ شادی سے انکار کر دے تو اس نے خاندان والوں کو انکار کر دیا۔ اس سے خاندان میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔ ایک موقع پر تو اس نے دھمکی دی کہ اگر مجھے وہاں شادی کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو میں خودکشی کرلوں گا۔ ہمارے ایک چچا نے خاندان کے بزرگوں کو منایا اور کہا کہ ہمیں جاوید اقبال کی خوشی کے لئے راضی ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ خاندان والے تیار ہو گئے اور جاوید اقبال کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس شادی میں نہ صرف رشتہ داروں اور ہمسایوں نے شرکت کی بلکہ شہر کے بہت سے اشرافیہ نے بھی حصہ لیا۔ ہماری دعا تھی کی جاوید اقبال اپنی نئی زندگی میں خوش رہے۔

لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا۔ شاید کسی کی نظر لگ گئی یا کسی نے کالا جادو کر دیا اور جاوید اقبال کی شادی ایک بحران کا شکار ہو گئی۔ شروع میں ہمیں مسئلے کی نوعیت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جاوید اقبال کے سسرال سعودی عرب میں رہتے تھے اور چونکہ جاوید اقبال کی بیوی ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی' اسے کہا گیا تھا کہ وہ چھوٹے بچوں کا خیال رکھے۔ اس نے جاوید اقبال سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کے گھر رہے۔ جاوید اقبال نے اسے اپنی ہتک سمجھا کیونکہ وہ گھر جوائی نہیں بننا چاہتا تھا۔ جب جاوید اقبال نے انکار کیا تو وہ اپنے خاندان کے پاس واپس چلی گئی اور ان کے رشتے میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اس بحران کے نتیجے میں ایک شادی شدہ انسان ایک دفعہ پھر مجرد ہو گیا۔

ایک نو بیاہتا مرد ہونے کے نتیجے عین ممکن ہے اس کی جسمانی خواہشات کی تسکین نہ ہوئی ہو اور وہ غلط راہ پر چل نکلا ہو۔ اس کی ورکشاپ میں کچھ نوجوان لڑکے کام کرتے تھے۔ شادی کے ٹوٹنے کے بعد وہ ان لڑکوں کے ساتھ غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکتوں میں ملوث ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گئیں اور وہ سنجیدہ مسائل کا شکار ہو گیا۔ ہمارے خاندان کی تاریخ

میں ایسے واقعات کبھی پیش نہیں آئے۔ ان واقعات میں موروثی اثرات کا کوئی دخل نہیں۔ جاوید اقبال کے جرائم اس ماحول کی پیداوار ہیں جس میں وہ پلا بڑھا۔ وہ اپنے معاشرے کو وہی لوٹا رہا ہے جو اس نے معاشرے سے حاصل کیا تھا۔

''آپ کو پہلی دفعہ کب پتہ چلا کہ اس نے بچوں کے ساتھ جذباتی اور جنسی ناانصافیاں کی ہیں؟''

'1990ء میں پہلی دفعہ اس پر ہم جنسی کا مقدمہ چلا تھا۔ اس واقعہ سے پورے خاندان پر ایک قیامت گزری تھی۔ ہمیں اس وقت بھی ایسے ہی المیے کا سامنا کرنا پڑا تھا جیسا کہ اب کرنا پڑ رہا ہے۔ ان دنوں میں بڑا انڈرتھ روڈ پر کام کیا کرتا تھا۔ ایک صبح جب میں اور ابو اپنی دکان پر کام کر رہے تھے کچھ لوگوں نے ہمارے گھر پر حملہ کیا۔ اس وقت صرف ہماری عورتیں گھر پر تھیں۔ جن لوگوں نے حملہ کیا وہ مسلح پٹھان تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ مرد دکان پر ہیں تو وہ ہماری دکان پر آئے اور ہم پر حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں زبردستی ایک رکشے میں بٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ جب ہم نے شادباغ کا پولیس سٹیشن دیکھا تو ہماری جان میں جان آئی۔ ہمیں خطرہ تھا کہ وہ لوگ ہمیں اغوا کر کے کسی انجانی جگہ پر لے جائیں گے اور پھر ہم پر تشدد کریں گے۔

پولیس نے ہمیں بتایا کہ جاوید اقبال نے کسی لڑکے کے ساتھ ہم جنسی کی ہے۔ وہ لوگ غصے میں چیخ چلا رہے تھے اور ہمیں گالیاں دے رہے تھے۔ ہمارے ابو ایک درویش منش نیک انسان تھے۔ انہوں نے کبھی پولیس سٹیشن نہ دیکھا تھا۔ جب انہوں نے اپنے بیٹے کی کہانی سنی تو ان کا سر شرم اور ندامت سے جھک گیا۔ اس واقعہ کے بعد ساری عمر وہ فخر سے اپنا سر نہ بلند کر سکے۔ پولیس نے ہم سب مردوں کو ایک ہفتہ حوالات میں رکھا۔ وہ پٹھان روز آ کر ہمیں گالیاں سناتے۔ وہ ہم سے پوچھتے کہ جاوید اقبال کہاں ہے اور ہم کہتے کہ ہمیں پتہ نہیں کیونکہ وہ گھر سے

بھاگ چکا تھا۔

''جاوید اقبال کسی بالغ یا نابالغ کے ساتھ ہم جنسی میں ملوث تھا؟''

''وہ نابالغ بچے کے ساتھ ملوث تھا۔ ہم اسے کہا کرتے تھے کہ بچوں سے دور رہو۔ ہم والدین سے کہا کرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو اس سے دور رکھا کرو۔ اس کا کردار ٹھیک نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد خاندان والے بھی اپنے لڑکوں کو جاوید اقبال سے دور رکھتے تھے۔

''حوالات میں ایک ہفتہ رہنے کے بعد ہمارے خاندان کی عورتیں پٹھانوں کی عورتوں سے ملنے گئیں اور ان سے کہا کہ اگر ہمارے مرد حوالات میں رہیں گے تو وہ کیسے جاوید اقبال کو گرفتار کرنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ مجرم تو جاوید اقبال ہے خاندان والے تو معصوم ہیں۔ یہ بات ان عورتوں کی سمجھ میں آ گئی اور ان کے مردوں نے پولیس سٹیشن آ کر ہمیں رہا کروا دیا اور پھر ہم نے جاوید اقبال کی گرفتاری میں پولیس کی مدد کی۔

پہلے ہم نے اس لڑکے کو تلاش کیا جس کے ساتھ جاوید اقبال کے جنسی تعلقات تھے اس کے بعد ہمیں امید تھی کہ جاوید اقبال اسے ڈھونڈتا خود ہی ہمارے پاس آ جائے گا۔ جاوید اقبال ایک عجیب وغریب انسان ہے اور اس کے لڑکوں کے ساتھ تعلقات بھی عجیب ہیں۔ اگر جاوید اقبال کے گھر والوں پر ظلم ہو تو وہ خاموش رہتا ہے لیکن اگر کوئی اس کے لڑکوں کو برا بھلا کہے تو وہ سیخ پا ہو جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں بھی اس کے لڑکے بہت وفادار ثابت ہوئے ہیں۔ پولیس نے بہت کوشش کی لیکن لڑکوں نے جاوید اقبال کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ سولی پر چڑھ جائیں گے لیکن جاوید اقبال کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ان لڑکوں نے ساری دنیا کو حیران کر رکھا ہے۔

''جب ہم نے لڑکے کو پکڑ لیا تو ہمیں جاوید اقبال مل گیا۔ وہ قلعہ گوجر سنگھ کے سپرینٹنڈنٹ پولیس گل اصغر سے ملنے گیا تھا۔ ہم جاوید اقبال کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو ہمیں دفتر میں لے جا کر کہنے لگا کہ اس پر الزامات بے بنیاد

ہیں۔سپرینٹنڈنٹ نے اس سے کہا کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے اور اگر الزامات بے بنیاد ہیں تو وہ رہا ہو جائے گا۔ہم جاوید اقبال کو گھر لے آئے اور اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔آخر ہم نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا اور پولیس کو فون کیا۔ان دنوں ملک شہاب الدین سارجنٹ ہوا کرتے تھے۔وہ تشریف لائے اور انہوں نے جاوید اقبال کو حراست میں لے لیا۔

چونکہ ہم سب چند دن حوالات میں تھے ہمارا کاروبار بند رہا اور لوگوں نے ابو سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے تو بہت شرمندہ ہوئے۔اس واقعہ نے انہیں اتنا پریشان کیا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال جانا پڑا۔خوش قسمتی سے وہ فوت نہیں ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی صحت قدرے بہتر ہوئی۔ جاوید اقبال کو چھ مہینے کی جیل کی سزا ہوئی۔ میرے ابو نے جاوید اقبال کی مدد کرنے کی بہت کوشش کی۔رقم بھی خرچ کی اور اسے جیل میں خط بھی لکھے۔میرے ابو ایک نہایت شریف انسان تھے وہ اپنے بچوں کی بھی عزت کرتے تھے اور انہیں ادب سے مخاطب کرتے تھے۔ان کی شخصیت میں کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد بھی جاوید اقبال مصر تھا کہ اس پر مقدمہ سیاسی دشمنی کی وجہ سے لگایا گیا ہے۔اس کا کہنا تھا کہ اس کی مقبولیت اور کامیابی کی وجہ سے لوگ اس سے حسد کرتے ہیں۔اس کو خیال تھا کہ اس کے سسرال اسے پسند نہیں کرتے اس لئے اس کی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ ہمارے والدین چونکہ سادہ اور معصوم لوگ تھے اس لئے اس کی باتوں میں آ گئے۔میرے ابو نے ہزاروں روپے خرچ کر کے جاوید اقبال کی قانونی مدد کی۔آخر عدالت میں کچھ قانونی مسائل کی وجہ سے جاوید اقبال رہا کر دیا گیا۔

جب جاوید اقبال جیل سے نکل کر آیا تو میرے والد کو فکر تھی کہ کہیں دوبارہ ہم جنسی تعلقات میں نہ ملوث ہو جائے چنانچہ انہوں نے اس کی شادی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش

کی ۔ہم سب نے سر جوڑ کر سوچا۔کئی دفعہ اس کی بیوی سے ملے لیکن اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔وہ کہنے لگی میں جاوید اقبال سے نفرت کرتی ہوں ۔اس وقت تک ان کے ہاں ایک بیٹی بھی پیدا ہو چکی تھی ۔ہم نے ایک وزیر ڈاکٹر بنگش سے بھی رابطہ قائم کیا۔انہوں نے بھی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔آخر جاوید اقبال کی بیوی نے کہا کہ میں اسے اجازت دیتی ہوں کہ وہ دوسری شادی کر لے۔جاوید اقبال کے سسر کا بھی یہی خیال تھا۔آخر ڈاکٹر بنگش نے ہتھیار ڈال دئے۔

اس دوران جاوید اقبال کے نوجوان رفقاء کار نے اس کا ایک اور عورت سے تعارف کروایا جس نے اس کے لئے دوسری بیوی تلاش کر لی ۔چنانچہ جاوید اقبال نے دوسری شادی کر لی اور ہم خوش ہوگئے کہ چلو اب جاوید اقبال ایک صحتمند زندگی گزارے گا لیکن پھر ہمیں پتہ چلا کہ اس کا نیا سسر غیر قانونی منشیات کا کاروبار کرتا ہے۔وہ جاوید اقبال کو آکر تنگ کیا کرتا تھا اور پیسے مانگا کرتا تھا۔ان حالات کی وجہ سے خاندان مین دوبارہ تشنج پیدا ہوا اور چھ مہینوں کے بعد وہ شادی بھی ناکام ہوگئی۔ یہ 1992 کی بات ہے۔اس واقعہ نے ابو کو اتنا پریشان کیا کہ انہیں دل کا دوسرا دورہ پڑا اور وہ 17 جولائی 1992 کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد ہمارا خاندان جائداد کے مسائل میں الجھ گیا۔ابھی والد صاحب کا جنازہ بھی نہ اٹھا تھا کہ مسائل نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔سب رشتہ دار اس بات پر متفق نہ تھے کہ جائداد کو کیسے تقسیم کیا جائے۔والد صاحب سب معاشی' کاروباری اور قانونی امور اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ ہمارے بہنوئیوں کا ہم پر اعتماد نہ رہا چنانچہ انہوں نے وصیت کے خلاف عدالت میں مقدمہ کر دیا اور ہماری بہنوں کو کچہری کے چکر لگانے پڑے جو ہم سب کے لئے شرم کی بات تھی۔ چنانچہ ہم نے جج سے کہا کہ وہ اس کیس کا فیصلہ جلد سے جلد کر دے۔آخر میں ہم نے اپنی اماں سے مشورہ کیا اور کیس کا فیصلہ کر دیا۔

ہم نے جاوید اقبال کو اس کے حصے کی جائداد دی اور اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرے تاکہ اس میں ذمہ داری کا احساس بڑھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس کے اعمال کی وجہ سے ہمیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ ہم نے اپنے ابو کا حال دیکھ لیا تھا اور ہم ان حالات کا دوبارہ سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جب جاوید اقبال کو اس کا حصہ مل گیا تو اس نے شیخ ناصر سے، جس کا ذکر اس نے اپنی ڈائری میں کیا ہے، رانا ٹاؤن میں جائداد خرید لی۔ شیخ ناصر میرا ہم جماعت تھا اور میں نے ہی اس کا تعارف جاوید اقبال سے کروایا تھا۔ شیخ ناصر جاوید اقبال سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ شیخ ناصر نے جاوید اقبال سے سودا کیا، جاوید اقبال سے بڑاندرتھ روڈ کی دکان خرید کر اسے ایک پجارو گاڑی اور رانا ٹاؤن کی جائداد دے دی۔ شروع میں تو جاوید اقبال خوش تھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ شیخ ناصر نے اس سے دھوکہ کیا ہے اور اس میں تلخی پیدا ہو گئی۔

رانا ٹاؤن کی زمین پر اس نے ایک خوبصورت گھر بنایا جس میں ایک شاندار سومنگ پول بھی تھا۔ وہ گھر کافی اجاڑ جگہ پر بنا تھا اور زیادہ محفوظ نہ تھا۔ کافی لوگ اس ویرانے میں لٹ چکے تھے۔ چنانچہ جاوید اقبال نے حالات سے گھبرا کر گھر بیچ دیا۔ پھر اس نے ایک نیا کاروبار شروع کیا اور مختلف جگہوں پر وڈیو سنٹر بنائے۔ وہ جہاں بھی کاروبار کرتا تھا ان میں بچوں کو ملوث کرتا تھا اور ہم کبھی بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ ہم اسے کہا کرتے تھے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرو اور جب ہمارے ہاں آیا کرو تو لڑکوں کو ساتھ مت لایا کرو۔ وہ کہا کرتا تھا ''یہ لڑکے میرے لئے کھانا پکاتے ہیں، میرا خیال رکھتے ہیں اور میرا کاروبار چلاتے ہیں۔'' چونکہ میں اس کے کاروبار اور طرزِ زندگی کے بالکل خلاف تھا اس لئے کبھی اس کے وڈیو سنٹر دیکھنے نہیں گیا۔ میں صرف ایک دفعہ اس کے ہاں فتح گڑھ گیا تھا اور اس کا وڈیو سنٹر دیکھا تھا جب اس نے والد صاحب کی یاد میں ایک مذہبی تقریب کا انتظام کیا تھا''۔

پرویز اقبال گفتگو کرتے ہوئے چند لمحوں کے لئے رکا اور کچھ جوس پیا۔ اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور ہماری باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پرویز اقبال نے کہانی وہیں سے شروع کی جہاں ختم کی تھی۔ ''جب ہم فتح گڑھ پہنچے تھے تو ہمیں دور سے بہت سی پولیس کی گاڑیاں نظر آئی تھیں۔ ہم پریشان ہو گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ پھر کسی غیر قانونی مسائل کا شکار ہو گیا ہو۔ ہم گاڑی موڑ کے جانے ہی والے تھے کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ ہم نے اپنے بیٹے کو بھیجا کہ وہ حالات کا جائزہ لے۔ ہمارے بیٹے نے آکر بتایا کہ سب پولیس والے اس کے دوست اور مہمان تھے۔ ہم اندر گئے لیکن پولیس سے دور رہے۔ دو گھنٹوں کے بعد وہ پولیس افسر محفل چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم نے بعد میں بھی کئی دفعہ اسے پولیس کے افسروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا۔ ایک زمانے میں وہ پولیس کے بارے میں ایک رسالہ بھی نکالا کرتا تھا۔ ہم نے کبھی پولیس کے ساتھ اس کی دوستی کو نہیں سراہا۔ ہمارے ابو کہا کرتے تھے ''قانون کی پابندی کرنے والوں کو پولیس سے دوستی کی ضرورت نہیں ہوتی''۔ لیکن جاوید اقبال ہمیشہ ان کے قریب رہا۔ وہ باقی لوگوں کی مدد کرنے کے لئے بھی پولیس کی مدد مانگا کرتا تھا۔ راناٹاؤن جانے کے بعد جاوید اقبال نے نیا کاروبار شروع کر دیا تھا اور وہ اس میں کافی کامیاب تھا۔

''آپ مجھے بتا رہے تھے کہ پولیس اور جاوید اقبال کا ایک دفعہ پھر آمنا سامنا ہوا تھا۔ کیا آپ اس کی تفصیل بتائیں گے؟''

''وہ واقعہ 1997 کا ہے جب جاوید اقبال پر ایک دفعہ اور ہم جنسی کا مقدمہ چلا تھا۔ جاوید اقبال کا خیال تھا کہ نسیم مرشد اور دوسرے دوست اس کی مدد کو آئیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جاوید اقبال کہا کرتا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس کی رقم دینی تھی اس پر جھوٹا مقدمہ چلا دیا تھا کیونکہ جاوید اقبال نے اپنا قرض مانگنا شروع کو دیا تھا۔ چونکہ اس پر ایک دفعہ پہلے اس قسم کا

مقدمہ چل چکا تھا اس لئے اس پر دوسری بار مقدمہ چلانا مشکل نہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اپنے تجربات سے کچھ سبق سیکھے اور اپنا طرزِ زندگی بدلے لیکن ایسا نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ جاوید اقبال اور اس کے خاندان کے درمیان خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔''

انٹرویو کے اس موڑ پر پرویز اقبال نے معذرت چاہی۔ انہوں نے اپنے کاروبار کر سلسلے میں کہیں جانا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھے جاوید اقبال کے حوالے سے اخبار کے کالم، پولیس کی رپورٹیں اور اس کی ڈائریاں دیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کے لئے تیار تھے تا کہ کہانی کا باقی حصہ مجھے بتا سکیں۔ انٹرویو کے آخر میں جب میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے جاوید اقبال کی بہن کھڑی دکھائی دیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسو انکی اپنے بھائی کی محبت کے آئینہ دار تھے۔ میں نے کبھی کسی بہن کی محبت کا اس سے زیادہ بھرپور ثبوت نہ دیکھا تھا۔

''کیا آپ مجھے جاوید اقبال کی پینٹنگز اور اخبار میں لکھے ہوئے کالم دکھا سکتی ہیں؟''

''میں معذرت خواہ ہوں وہ سب پولیس نے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں۔''

میں نے جاوید اقبال کے خاندان کو خیر باد کہا اور چلا آیا۔ اس شام میں نے سونے سے پہلے انٹرنیٹ پر اپنی رفیقِ کار این اگیری کو مندرجہ ذیل ای میل بھیجا:

ڈئیر این!

تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں جاوید اقبال کا پھانسی گھاٹ میں انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ عابد حسن منٹو صاحب نے مجھے اجازت دلوانے میں بہت مدد کی اور میرے کزن شعیب نے مجھے شہر میں کافی گھمایا پھرایا۔ وہ شہر میں بہت سے اصحابِ بست وکشاد کو جانتا ہے اس لئے مجھے مشکلات نہیں ہو رہیں۔ چونکہ مجھے جاوید اقبال سے ملنے ایک دفعہ پھر جانا ہے اس لئے میں یہاں ایک ہفتہ اور رہنا چاہتا ہوں تا کہ جو کام شروع کیا ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ اگر تم اگلے ہفتے کے مریض کینسل کر سکو تو بہت نوازش ہوگی۔ جاوید اقبال کی کہانی میری

توقعات سے زیادہ پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ میں تمہیں اپنے انٹرویو کی کاپی بھیجوں گا تا کہ تم اپنا اظہارِ خیال کر سکو۔ ای میل نے بہت سے مسائل حل کر دیئے ہیں اب ہمیں خطوط کا ہفتوں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ تمہیں میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے دوست اور گھر والے میرا خیال رکھ رہے ہیں۔

مخلص خالد سہیل

==========

دسواں باب ... ہم جنسی کا واقعہ اور عوام کا ردِ عمل

اس شام جب میں جاوید اقبال کی ڈائری اور اس کے بارے میں اخبار میں چھپے کالم پڑھ رہا تھا تو شعیب کا فون آیا۔ پوچھنے لگا ''کیا آپ جاوید اقبال کے ہمسایوں کو انٹرویو کرنا پسند فرمائیں گے؟''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم انہیں بالکل نہیں جانتے؟''

''میرا دوست عابد ان کی گلی میں رہتا ہے اور سب ہمسایوں کو برسوں سے جانتا ہے۔ اس نے ہمسایوں سے بات کی ہے اور وہ انٹرویو دینے کے لئے تیار ہیں''۔

''یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ اگر ممکن ہو تو کل ان سے مل لیں''۔

چنانچہ شعیب نے سارا انتظام کر دیا اور ہم دوبارہ شہر کی جانی پہچانی گلیوں اور گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے شاد باغ مارکیٹ پہنچ گئے جہاں جاوید اقبال کے ہمسائے اور پرانے رفقاءِ کار ہمارے منتظر تھے۔

عارف بٹ سے انٹرویو:

عارف بٹ نے' جو ایک خوش مزاج جوان تھا' ہمارا تعارف پہلے ایک چھوٹے قد کے رفیقِ کار شہباز سے کروایا اور پھر ایک دراز قد' باریش مرد اسلم درویش سے ملوایا۔ میں نے مختصراً اپنا تعارف کروایا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے انٹرویو کا سلسلہ عارف بٹ سے شروع کیا۔

''آپ جاوید اقبال کو کب سے اور کس حوالے سے جانتے ہیں؟''

''میں پچھلے بیس برس سے شاد باغ مارکیٹ ایسوسی ایشن کا جنرل سیکرٹری ہوں۔ میں جاوید اقبال کو ۱۹۸۵ء سے جانتا ہوں۔ ہم ایک زمانے میں ہمسائے ہوا کرتے تھے اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے لیکن ان دنوں ہماری زیادہ ملاقاتیں نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ دور آیا جب جاوید

اقبال نے اس مارکٹ میں ایک وڈیوسٹور کھول لیا اور وہ ایک فعال سماجی کارکن بن گیا۔ ایک دفعہ اس نے سستی چیزیں بیچنے کا کیمپ بھی لگایا تھا اور ایک وزیر کو بھی بلایا تھا۔ اس کیمپ میں میں بھی شریک تھا۔

مجھے وہ وقت بھی یاد ہے کہ جنرل سیکرٹری ہونے کے ناطے میرے پاس جاوید اقبال کا کیس آیا۔ لوگوں نے شکایت کی کہ جاوید اقبال نے ایک لڑکے کے ساتھ بدفعلی کی ہے۔ ان دنوں ہمارے صدر خواجہ مختار ہوا کرتے تھے۔ ہم نے تحقیق کی تو وہ الزام صحیح ثابت ہوا۔ ہم نے شہر کے معززین کو جمع کیا اور اس معاملے پر تبادلہِ خیال کیا گیا۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ جاوید اقبال اس علاقے سے چھ ماہ کے لئے کہیں اور چلا جائے اور جاوید اقبال مارکٹ کی ہر دکان پر جا کر معافی مانگے اور اعتراف کرے کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے۔ ہم نے جاوید اقبال سے بات کی اور اس سے یہ سب کچھ ایک اشٹام پیپر پر لکھوا لیا۔ اس کی کاپی خواجہ مختار کے پاس ہوا کرتی تھی جو اب وفات پا چکے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد جاوید اقبال ہمیں ایک سال کے لئے اس علاقے میں نظر نہیں آیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کی شادی ہو چکی تھی اور بیوی سے اختلافات شروع ہو چکے تھے۔''

''مجھے جاوید اقبال کی شادی کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''جاوید اقبال ڈاک خانے کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک نالیوں کی فیکٹری تھی جہاں اس کے بھائیوں نے اب ایک پلازا بنا لیا ہے۔ اس کا تعلق ایک شریف اور عزت دار خاندان سے تھا۔ وہاں اس کی ایک عورت سے ملاقات ہوئی جو بعد میں اس کی ساس بن گئی۔ جاوید اقبال کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی تھی۔ ہم سب اس شادی میں شامل ہوئے تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد شادی ختم ہو گئی۔ ہمیں بالکل پتہ نہ چلا کہ مسئلہ کیا تھا۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ اس نے ضرور کوئی ایسی سنگین حرکت کی ہوگی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن ہم

جانتے تھے کہ ازدواجی رشتہ اتنا ذاتی اور نازک رشتہ ہے کہ آپ اس کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہیں کر سکتے۔ ہم سب نے کوشش کی کہ ان کی صلح صفائی ہو جائے لیکن ہم ناکام رہے۔ اس کی بیوی ایک دفعہ واپس جاوید اقبال کے پاس گئی بھی تھی لیکن جلد ہی دوبارہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

بعد میں جب اس نے لڑکے کے ساتھ بدفعلی کی تو وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا اور پھر ہماری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہمیں اس کے بہنوئی سے پتہ چلا کہ وہ سارے خاندان کے لئے باعثِ ندامت بن رہا تھا۔

اس علاقے کو چھوڑنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ اس نے فیروز پور میں جائداد خریدی ہے اور وہاں رہنا شروع کر دیا ہے۔ دو تین سال پہلے ہم نے خبر سنی تھی کہ وہ ہسپتال میں داخل ہے۔ جاوید اقبال کے بھتیجے ندیم نے مجھے بتایا کہ جاوید اقبال نے داتا دربار سے ایک نوجوان مالشی بلایا تھا جس نے مالش کرنے کے بعد جاوید اقبال کو اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو گیا اور اسے ہسپتال داخل کرنا پڑا۔ جاوید اقبال کو بیہوش کرنے کے بعد وہ مالشی اس کے گھر سے ایک بھاری رقم چوری کر کے بھاگ گیا۔ میں نے وہ واقعہ سن کے سوچا کہ اس کے پیچھے ضرور اور بھی کچھ ہو گا۔

اس واقعہ کے تین ہفتے کے بعد مجھے ندیم ملا تو اس نے بتایا کہ جاوید اقبال کو ہوش آ گیا تھا اور ڈاکٹروں نے اسے گھر بھیج دیا ہے۔ اسی دوران اس کے والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

جب ہم نے یہ خبر سنی کہ جاوید اقبال نے پولیس کو خط لکھا ہے اور سو بچوں کو قتل کرنے کا اعترافِ جرم کیا ہے تو ہم نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک بزدل انسان ہے۔ اس میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں کہ وہ سو بچوں کو قتل کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہمیشہ ایسی فلمیں دیکھا کرتا تھا جو مار دھاڑ سے بھرپور ہوتی تھیں۔ وہ فلموں میں ایکشن اور تشدد پسند کرتا تھا۔ ان سب چیزوں کے باوجود وہ ایک دو قتل تو کر سکتا ہے' سو بچوں کو قتل نہیں کر سکتا۔ اسے زندگی بھر ڈرامہ کرنے کا شوق تھا۔ اسے بندوقیں پسند تھیں اور وہ پٹھانوں کو لوہے کی نالیاں بیچا کرتا تھا تا

کہ وہ پستولیں بنا سکیں۔

وہ بہت ذہین انسان ہے۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ روپوش ہو گیا ہے تو ہمیں یقین تھا کہ پولیس اسے نہ پکڑ سکے گی۔ وہ جب چاہے گا خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرے گا اور آخر میں ہوا بھی یہی۔ پولیس نے اسکے بھائیوں اور بھتیجے کو حوالات میں رکھا اور جاوید اقبال کو تلاش کرتے رہے۔ جاوید اقبال کے خاندان نے ہماری مدد چاہی لیکن ہم بے بس تھے۔ وہ کوئی عام کیس تو تھا نہیں۔ وہاں تو سو بچوں کے قتل کا مسئلہ تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب جاوید اقبال نے ایک لڑکے کے ساتھ بد فعلی کر کے اسے باغ میں چھوڑ دیا تھا۔ بچے کے والدین نے اسے باغ میں بیہوش پایا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں بچے معصوم اور نادان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی۔

اپنی بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ اس کے والد کو اس سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اسے بہت پیسے دیتے تھے۔ جاوید اقبال کی پٹھانوں سے بہت دوستی تھی اور لوگ کہتے تھے" اسے پٹھان پسند ہیں وہ ان کے ساتھ سوتا ہے"۔

ہم سوچا کرتے تھے کہ اگر اس نے واقعی سو بچوں کو قتل کیا ہے تو اس کا کسی کو کوئی ثبوت کیوں نہیں ملا۔ کیا وہ اتنا چالاک، ہوشیار اور مکار ہے۔ میرے دوست مقصود ہیرا نے، جو جنگ اخبار میں کام کرتا ہے، کل رات مجھ سے پوچھا کہ کیا میں جاوید اقبال کو ملنا چاہتا ہوں تو میں نے کہا" میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک غلیظ انسان ہے۔ میں اس کی منحوس صورت سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں"۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ پہلے اس نے اقرارِ جرم کیا اور جب عدالت میں گیا تو انکار کر دیا۔ وہ مجموعۂ تضادات ہے۔ اپنی کہانی بدلتا رہتا ہے۔ وہ سچ کو جھوٹ سے ملاتا رہتا ہے۔

سو بچوں کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔

شہباز سے انٹرویو:

عارف بٹ سے گفتگو کے بعد میں نے شہباز سے پوچھا ''آپ کچھ اپنے بارے میں اور کچھ جاوید اقبال کے بارے میں بتائیں''۔

''میں اس علاقے میں پچھلے پچیس برس سے بزنس کر رہا ہوں۔ آج کل میں معراج دین ٹیلر شاپ پر کام کرتا ہوں۔ میری پہلی دفعہ جاوید اقبال سے ملاقات ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں شہباز لائبریری میں کام کیا کرتا تھا۔ جاوید اقبال اس لائبریری میں کتابیں اور رسالے پڑھنے آیا کرتا تھا۔ وہ ایسی کتابیں پڑھتا تھا جن میں جاسوسی اور مار دھاڑ سے بھرپور کہانیاں ہوتی تھیں۔ مجھے تو وہ شروع سے بالکل پسند نہ تھا۔ پھر اس نے وڈیو سٹور کا کام شروع کیا۔ میں اس کے سٹور میں وڈیو کی مرمت کرنے جایا کرتا تھا۔

مجھے اس دور کا ایک واقعہ آج تک یاد ہے۔ اس کے سٹور میں لڑکے وڈیو سے کھیل رہے تھے۔ میں ایک طرف ایک وڈیو کی مرمت کر رہا تھا۔ اس نے سو روپے کا نوٹ زمین پر پھینک دیا۔ ایک لڑکے نے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے لڑکوں سے پوچھا کہ اس کو سو روپے کا نوٹ کھو گیا ہے کسی نے اٹھایا تو نہیں۔ سب لڑکوں نے انکار کیا۔ اس نے سب لڑکوں کی تلاشی لی اور جس لڑکے نے سو روپے کا نوٹ اٹھایا تھا اس کی تلاشی سب سے آخر میں لی اور پھر اسے اندر لے گیا۔ اس دنوں اس کا گھر اس کے سٹور کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ لڑکے کو اندر کیوں لے کر گیا ہے۔ وہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کرتا ہے۔ جیسا کہ عارف بٹ نے بتایا ہے وہ اس سے پہلے بھی ایک لڑکے سے بدفعلی کر کے اسے باغ میں پھینک چکا تھا۔ یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ وہ شروع سے ہی بری ذہنیت کا مالک تھا اور مجرمانہ شخصیت رکھتا تھا''۔

حاجی اسلم درویش سے انٹرویو:

پھر میں حاجی اسلم درویش کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا ''اب آپ مجھے کچھ اپنے اور کچھ جاوید اقبال کے بارے میں بتائیں''۔

وہ کہنے لگے ''میں شادباغ مارکٹ ایسوسی ایشن کا پچھلے تیس سال سے صدر ہوں۔ صدر بننے سے پہلے میں اس کا سیکرٹری ہوتا تھا۔ جاوید اقبال نے اس علاقے میں کافی وقت گزارا ہے۔ جاوید اقبال جرم کم اور ڈرامہ زیادہ کرتا تھا۔ اسے خودنمائی کا بہت شوق تھا۔ ہمیں پہلے اندازہ نہ تھا کہ اسے ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کر کہتا تھا کہ میں نے رمضان بازار لگانا ہے۔ ایک دفعہ اس نے بازار لگایا بھی اور افتتاح کے لئے ایک وزیر کو بھی بلایا۔

بعد میں جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ ایک کرپٹ corrupt انسان ہے تو ہم نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس دور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو بہت افسوسناک تھا۔ ہماری مارکٹ میں بشیر کی بوتلوں کی دکان تھی۔ اس کا نوکر جاوید اقبال کو بوتل دینے گیا تو اس نے لڑکے کو پھنسا لیا۔ وہ لڑکا غریب تھا اور اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ وہ کیس ہمارے سامنے آیا تو ہم نے تفتیش کی۔ میں لڑکے کے والدین سے ملا لیکن انہوں نے مقدمہ دائر کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسے واقعہ کو صیغۂ راز میں رکھنا ہماری کمیونٹی کے لئے اچھا نہیں ہے لیکن انہوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جاوید اقبال نے پیسے دے کر ان کا منہ بند کر دیا تھا۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جاوید اقبال نے ایک اور لڑکے کے ساتھ بدسلوکی کی۔ جب ہمیں پتہ چلا تو ہم نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے لڑکے کے والدین کو بلایا لیکن انہوں نے بھی مقدمہ دائر کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ جاوید اقبال نے انہیں بھی کچھ رقم دی تھی۔ اس طرح ہمیں پتہ چل گیا کہ وہ لوگوں کو پیسے دے کر بلیک میل کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی کمزوری جان لیتا ہے اور پھر اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

ایک دفعہ ہم نے اسے بدفعلی کرتے پکڑ لیا اور اسے سب کے سامنے جوتے مارے۔ہم نے اس سے اشٹام پیپر لکھوایا اور معافی نامے پر دستخط کروائے۔اس نے وعدہ کیا کہ وہ بازار چھوڑ کر چلا جائے گا۔

''کیا آپ کا خیال ہے کہ جاوید اقبال نے سو بچوں کا قتل کیا ہے؟''

''وہ ایک ڈرپوک اور بزدل انسان تھا۔وہ سو بچوں کا قتل نہیں کر سکتا۔ماضی میں جب بھی وہ پکڑا گیا تھا اس نے لوگوں کو رشوت دے کر خود کو چھڑوا لیا تھا۔اس نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ہوسکتا ہے اس کے ساتھیوں نے قتل کیے ہوں لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ قتل کرنے کے قابل نہیں ہے۔''

''کیا آپ کا خیال ہے کہ جاوید اقبال سے بچپن میں زیادتیاں ہوئی تھیں؟

''جب وہ رام گلی کے سکول میں تھا تو اس کے ساتھ بدفعلی ہوئی تھی اور پھر اس نے اوروں کے ساتھ بدفعلی شروع کر دی۔پھر تو وہ اس کا شوقین بن گیا تھا۔اس نے جب ایک دفعہ کہا تھا کہ میں ماضی کا بدلہ لے رہا ہوں تو میں نے کہا تھا تم رام گلی والوں کو بدلہ شادباغ والوں سے کیوں لے رہے ہو۔ہماری تو ایسی باتوں سے بے عزتی ہوتی ہے۔آخر میں وہ شادباغ چھوڑ کر غازی آباد چلا گیا تھا۔

ان دنوں وہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔اس نے مجھے ایک رسالہ دکھایا تھا اور شیخی بگھارتے ہوئے کہا تھا''میں پولیس کی کرپشن کے خلاف رسالہ نکالتا ہوں'' پھر اس نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا تھا''اگر آپ کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں''۔اور میں نے جواب دیا تھا''مجھے تمہاری مدد کی کیا ضرورت پڑے گی۔میں خدا کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوں تم اپنا خیال رکھو۔

ایک دفعہ میں شادباغ پولیس کے چیف شہاب الدین کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ جاوید

اقبال آیا۔اس نے آتے ہی میز پر اپنا رسالہ پھینکا اور کہا ''رسالے کو دیکھو۔میں نے تمہاری کچھ اچھی تصویریں چھاپی ہیں''۔وہ لوگوں کی خوشامد کرتا تھا اور پھر ان سے ناجائز فائدے اٹھاتا تھا۔''

''آپ کی نگاہ میں جاوید اقبال کی شادی کی ناکامی کی کیا وجہ تھی؟''

''میں صدر ہونے کی حیثیت سے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ان کی مدد کرتا تھا۔اسماعیل بٹ میری مدد کیا کرتے تھے۔ہمارے پاس جاوید اقبال کا کیس آیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بدفعلی کرتا ہے۔ہم نے اس کی بیوی کی منت سماجت کی تو وہ ایک دفعہ تو واپس چلی گئی لیکن جب اس نے دوبارہ وہی حرکت کی تو دوبارہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔اس نے وعدہ کر کے وعدہ توڑ دیا۔اس واقعہ کے بعد اس کی بیوی اس سے بالکل متنفر ہوگئی تھی۔اس وقت ہمیں بھی اندازہ ہوگیا کہ اسے صرف لڑکوں میں دلچسپی تھی۔اسے عورتوں کا بالکل شوق نہیں تھا''۔

عارف بٹ' شہباز اور اسلم درویش نے بتایا کہ جب سے جاوید اقبال وہاں سے گیا تھا اس مارکٹ کا ماحول پر سکون ہوگیا تھا۔

اس شام جب میں گھر گیا تو میں نے پولیس کی رپورٹیں نکالیں تاکہ مجھے واقعات کی حقیقت کا اندازہ ہوسکے۔پہلی پولیس رپورٹ 1990 کی تھی۔

پولیس رپورٹ۔تھانہ شادباغ:

رپورٹ نمبر:90...0243

کیس:12-7-79 اسلامک قانون۔ہم جنسی (خلافِ وضعِ فطری)

بیان۔محمد اقبال ولد عبدالغنی پٹھان

پتہ۔مکان 486 نبی بخش پارک لاہور

شہادت۔محمد اسلم۔ذوالفقار پٹھان

واقعہ۔کوٹھی 144 شادباغ لاہور:

تاریخ۔15 ستمبر۔1990

میں، محمد اقبال، جو مندرجہ بالا پتہ پر رہائش پذیر ہوں اور لنڈا بازار میں کام کرتا ہوں، پولیس کو مندرجہ ذیل بیان دیتا ہوں۔

میں کل 14 ستمبر کو مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا تھا۔جب میں واپس آیا تو میرا نو سالہ بیٹا گھر پر موجود نہ تھا۔میں پریشان ہو گیا۔میں گھر سے باہر آیا اور اپنے بھائی محمد اسلم سے پوچھا کہ کیا اس نے عرفان کو دیکھا ہے۔وہ کہنے لگا کہ اس نے عرفان کو بائیسکل کے ساتھ ایک دس سالہ لڑکے کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا۔چنانچہ میں، میرا بھائی محمد اسلم اور ایک دوست ذوالفقار پٹھان عرفان کو تلاش کرنے لگے۔جب ہم محمد علی اور جاوید اقبال کے گھر کے آگے سے گزرے تو ہمیں عرفان کی چیخوں کی آواز آئی۔ہم نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا کیونکہ اسے اندر سے تالا نہ لگا تھا۔ہم نے عرفان کو زمین پر منہ کے بل لیٹے ہوئے اور شلوار اترے ہوئے پایا اور اسکے اوپر جاوید اقبال کو شلوار اتارے ہوئے چڑھا ہوا دیکھا۔وہ اسکے ساتھ خلاف وضع فطری کر رہا تھا۔ہمیں دیکھتے ہی اس نے شلوار کو اوپر کیا اور بھاگ گیا۔

میرے بیٹے نے بتایا ”میں اپنے دوست کے ساتھ ۱۴۴ شادباغ کے آگے سے گزر رہا تھا کہ اس گھر سے ایک مرد آیا اور مجھے اندر لے گیا اور میری شلوار اتار کر مجھے منہ کے بل لٹا دیا اور میرے اوپر اپنی شلوار اتار کر چڑھ کر میرے ساتھ بدفعلی کرنے لگا۔میں نے درد کی وجہ سے شور کرنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔اتنے میں آپ آگئے اور وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔میں جاوید اقبال کے خلاف پولیس میں اپنے بیٹے عرفان کے ساتھ بدفعلی کرنے پر بیان دیتا ہوں۔

پولیس افسر نصراللہ خان

جب میں نے جاوید اقبال کے کاغذات دیکھے تو مجھے اس کی ڈائری ملی۔ جاوید اقبال کو شروع سے ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ اس ڈائری کو پڑھنے سے نہ صرف واقعات کا پتہ چلتا تھا بلکہ جاوید اقبال کی ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ جاوید اقبال نے کبھی اعتراف نہیں کیا کہ اس نے کوئی غلط کام کیا تھا۔ وہ ہمیشہ مصر رہا کہ وہ سارا کیس ''غلط فہمی'' پر مبنی تھا۔

جاوید اقبال کی پرانی ڈائری کے اوراق۔ ستمبر 1990۔ مارچ:1991

14 ستمبر: شام 4 بجے غلط فہمی کی وجہ سے مقدمہ بنا۔ رات 12 بجے سے صبح تک پریشان رہا۔ سعید ہمراہ تھا۔ سعید سے 10 ہزار روپے لئے۔ صبح مغلپورہ چھوڑ آیا۔

15 ستمبر: حاجی... والد صاحب اور پرویز صاحب کی گرفتاری۔ میری روانگی گوجرانوالہ' واپسی اور شام کو گھر ملاقات۔

16 ستمبر۔ اقبال کو ملا 1000 روپے والدہ کو دے کر گیا۔ 12 بجے راولپنڈی کیلئے روانگی ہمراہ یاسین اور اس کا بیٹا۔ شام کو مری کے ہوٹل میں قیام۔

17 ستمبر۔ ہوٹل میں قیام۔۔ ذہنی پریشانی۔

۱۸ ستمبر۔ لاہور ٹیلیفون کیا۔ رات مری ہوٹل میں قیام۔

19 ستمبر۔ ہوٹل بدلنے کا فیصلہ۔ سارا دن نئی جگہ دیکھنے اور ڈھونڈتے رہے۔ رات اسی ہوٹل میں گزاری۔

20 ستمبر۔ تریٹ میں جگہ لی۔ سارا دن خریداری۔ 1200 روپے ادائیگی ایڈوانس۔

21 ستمبر۔ اسی جگہ سوئے۔ سارا دن پریشان اور بے چین رہا۔

22 ستمبر۔ روانگی لاہور۔ رات نو بجے مغلپورہ سے سعید کو فون کیا۔ گھر آمد۔

23 ستمبر۔ اقبال کی گرفتاری کے سبب پریشانی رہی۔ گھریلو پریشر برائے میری گرفتاری۔ میں گھر سے صبح چلا گیا مگر چوہدری گل اصغر سے شام کو ملاقات کے بعد واپس گھر

سویا۔سونا بیچ دیا۔

24 ستمبر۔بھائیوں سے تلخ کلامی ہوئی۔اقبال کے گھر گیا۔رات جاگ کر گزاری۔جانا چاہتا تھا مگر امی کے کہنے پر رک گیا۔اقبال کی طرف سے پریشانی۔

26 ستمبر۔شام 4 بجے تک لیٹا رہا۔شام کو سعید نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔رات کو تھانے میں سویا۔حوالات میں اقبال سے ملاقات۔ایس ایچ او کو جیب والے چار ہزار روپے دے دیئے۔

27 ستمبر۔تھانہ میں سارا دن بند رہا۔شام کو اقبال کے ساتھ سویا۔

28 ستمبر۔اقبال کے ساتھ رہا۔آج آغا صاحب سے ملاقات ہوگئی۔گھر سے کوئی نہیں آیا۔پریشانی میں کھانا پینا چھوڑ دیا۔رات کو اقبال کے ساتھ ہی تھانے میں رہا۔

29 ستمبر۔تھانے میں کھانا پینا چھوڑے رکھا۔ایس ایچ او کی طرف سے پریشانی اور شام کو 3 بجے حوالات میں بند۔گھر والوں کا پریشر۔والد صاحب کی طرف سے یقین دہانیاں اور کہا گیا ہے کہ 20 ہزار ادا کیا گیا ہے کہ صلح ہو جائے۔

۳۰ ستمبر۔آج ایس پی کے روبرو پیشی۔رات کو ڈاکٹری ملاحظہ۔اقبال کی رہائی۔آج پہلی رات حوالات میں اکیلا سویا۔

7 اکتوبر۔آج صبح امین صاحب سے ملاقات۔یاسین اور پھر سعید، پرویز اور حاجی سے جیل میں ملاقات ہوئی۔مزید 500 روپے سعید سے لئے۔

5 نومبر۔یاسین سے 1000 روپے منگوائے۔ڈپٹی گیٹ کیپر اور عملہ کو 700 روپے تقسیم کیے۔150 روپے کا خرچہ کیا سامان منگوایا۔

7 نومبر۔یاسین سے 1000 روپے منگوائے۔

26 نومبر۔آج میری تاریخِ مقدمہ ہے۔اگلی تاریخ 8 دسمبر 1990 پڑی ہے۔

5 جنوری۔ میری تاریخ مقدمہ ہے۔ حاجی صاحب اور ضیاء سے ملاقات ہوئی، انہوں نے 15 روز کا وقت لیا اور کہا کہ خود ہی ضمانت کروادے گا۔ وہ عابد چوہدری کے لئے پھل اور مٹھائی لائے۔

16 مارچ۔ سیشن کورٹ سے رہائی۔ باعزت بری۔

==========

جاوید اقبال کے نام ... والد کا خط:

جاوید اقبال کا اپنے والد سے رشتہ بہت پرمعنی اور گھمبیر تھا۔ اگرچہ وہ اپنے بیٹے کے جیل جانے پر ندامت محسوس کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کی مدد کرنے سے کبھی منہ نہیں موڑا اور آخری دم تک اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار رہے۔ جب باقی لوگوں نے جاوید اقبال کا ساتھ چھوڑ دیا تھا وہ اس وقت بھی ثابت قدم رہے۔ ان کا مندرجہ ذیل خط ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

برخوردار جاوید اقبال

اسلام علیکم ! آپ کے بار بار کہنے پر آج رقعہ لکھ رہا ہوں۔ ہم تو دن رات بے چین و پریشان رہتے ہیں۔ آپ کو جیل میں میں اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب آپ کی نظر میں لاکھ یا پچاس ہزار کی کچھ ویلیو نہیں مگر بیٹے تمہارا باپ کوئی لینڈ لارڈ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں صبح سات بجے سے شام سات بجے تک مزدوری کرتا ہوں۔ کوئی ٹھوس آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے۔ میرے لئے تو یہ زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے کیونکہ میں نے آج تک جو کمایا اس سے یا تو دکان کے لئے مال خریدا یا بچوں کے کاروبار اور شادیوں پر خسرچ کیا۔ غرض میری آمدنی اس سے زیادہ نہ تھی کہ میں روپیہ جمع کرسکتا۔ اللہ کریم کا شکر ہے وقت عزت آبرو سے گزرتا گیا۔ اب

اس جرم کی وجہ سے نہ عزت رہی نہ وقار۔ روپیہ بھی بہت غلط طریقہ سے خرچ ہو گیا۔ اب میں نہ کسی سے قرض مانگ سکتا ہوں نہ مجھے کوئی دینے کو تیار ہے۔ میرے پاس صرف گاڑی ایک ایسی چیز ہے جس سے ضرورت پڑنے پر رقم مل سکتی ہے لیکن اس کی مجھے ضرورت رہتی ہے۔ نہ میرے پاس سٹے کا کوئی کام ہے نہ تھوک کا کوئی مال ہے۔ میں آپ کو خرچ کی تفصیل بتاؤں تو آپ کو خود میری پریشانی کا اندازہ ہو جائے گا۔

میں نے ایک لاکھ والی چار کمیٹیاں ڈال رکھی ہیں اور ان میں سولہ سو' نو ہزار' چار ہزار اور تیس ہزار روپے ڈال چکا ہوں۔ یاسین صاحب نے بھی کمیٹی ڈالی ہے اور وہ بھی تیسرے یا چوتھے روز سو روپے لے جاتے ہیں۔ نسیم صاحب میرے پاس آئے تھے میں نے انہیں ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا ہے وہ کوشش کر کے تمہارا کام ٹھیک کر دیں گے۔ حاجی اعجاز بھی کوشش میں مصروف ہیں۔ میں غافل نہیں ہوں جو مجھ سے ہو سکے گا کروں گا۔

فقط۔ والسلام۔ محمد علی

جاوید اقبال پر ہم جنسی کا دوسری بار مقدمہ 1998 میں چلا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے دوستوں نے اس کے ساتھ دغا کیا ہے کیونکہ وہ ان سے اپنا قرض مانگ رہا تھا۔ پرویز اقبال اپنے بھائی سے اتفاق کرتے ہیں۔ جاوید اقبال کے ساتھیوں میں آہستہ آہستہ کمی ہوتی گئی اور والد کی وفات کے بعد اس کے خاندان نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

پولیس رپورٹ۔ فروری 1998:

رپورٹ کرنے والا۔ فقیر محمد ولد فتح محمد

پولیس سٹیشن۔ لوئر مال لاہور

جرم: 12-7-79۔۔۔ اسلامک قانون۔ ہم جنسی (خلاف وضع فطری)

جائے وقوعہ۔ مین بازار داتا دربار

تاریخ۔12 فروری 1998

پولیس افسر۔ندیم یاسین

میں، فقیر محمد، ساکن لوئر مال لاہور، مچھلی منڈی میں کام کرتا ہوں اور گیارہ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں، میں پولیس کو مندرجہ ذیل رپورٹ لکھوا رہا ہوں۔

میرے دو بیٹے نو سالہ یاسر عباس اور گیارہ سالہ قمر عباس میرے ساتھ مچھلی منڈی میں رہتے ہیں اور کاپیوں والے ریاض کے ساتھ دکان پر کام کرتے ہیں۔نو فروری ۱۹۹۸ء کو میں خاص کام سے گاؤں گیا۔جب میں واپس آیا تو میرے دونوں بیٹوں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ وہ نو فروری کو دعا مانگنے داتا دربار گئے تھے۔ساڑھے نو بجے ایک مرد (جو بعد میں پتہ چلا کہ جاوید اقبال ولد محمد علی تھا) نے ہمیں اپنی کار میں دھکیلا اور ہم سے کہا کہ اس کے بیٹے کی تلاش میں اس کی مدد کریں۔تھوڑی دیر وہ کار چلاتا رہا پھر ہمیں ایک تنگ و تاریک گلی میں لے گیا۔اس نے پستول نکالی اور ہم سے کہا کہ ہم اپنے کپڑے اتار دیں۔ہم اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ ہم نے کپڑے اتار دئے۔پھر اس نے اپنے کپڑے اتارے اور ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ زبردستی بدفعلی کی۔پھر اس نے ہمیں 113 روپے دئے اور ہمیں کار سے باہر پھینک دیا۔جاتے ہوئے کہنے لگا کہ جمعرات کو پھر داتا دربار آنا اور میرا انتظار کرنا۔

چنانچہ میں اور عبدالطیف اپنے بیٹوں کو لے کر جمعرات کو دوبارہ داتا دربار گئے۔جاوید اقبال اپنی کار (پلیٹ نمبر LHU 905) میں آیا۔جونہی اس نے کار روکی ہم نے جاوید اقبال اور اس کی کار کو قابو کرلیا اور پولیس سٹیشن لے آئے۔

میں پولیس کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ جاوید اقبال نے میرے بیٹوں یاسر عباس اور قمر عباس کے ساتھ زبردستی بدفعلی کی ہے۔

==========

پولیس کی رپورٹ پڑھ کر مجھے ہم جنسی کے بارے میں پاکستانی قانون کا تجسس پیدا ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ قانون صرف نابالغوں پر ہی لاگو ہوتا ہے یا اس کی زد میں بالغ مرد و زن بھی آتے ہیں۔ چنانچہ میں نے عابد حسن منٹو کو فون کر کے پوچھا۔ وہ فرمانے لگے۔ ''پاکستانی قانون بالغ اور نابالغ میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ہم جنسی پاکستان میں غیر قانونی عمل ہے۔ اس میں جو بھی ملوث ہوتا ہے اسے سزا ملتی ہے''۔

===========

جاوید اقبال کے بارے میں رپورٹیں پڑھتے ہوئے مجھے وہ خط ملا جو اس نے پولیس اور میڈیا کو بھیجا تھا۔ وہ مندرجہ ذیل ہے۔

جاوید اقبال کا خط۔ پولیس اور میڈیا کے نام

''فتح گڑھ میں میرے ملازم 12 سالہ ارباب کے ہمراہ میرا بے دردی سے ''قتل'' کر دیا گیا۔ میرے چھوٹے ملازم کی سوتے ہوئے سر پر بندوق کے بٹ مار کر کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی۔ میرا جبڑا توڑ دیا گیا' آنکھ ضائع کر دی گئی اور ریڑھ کی ہڈی فریکچر کر دی گئی۔ چلنے پھرنے سے بھی معذور کر دیا گیا۔ میں 22 روز تک جنرل ہسپتال میں مسلسل بے ہوش رہا۔ ڈاکٹروں نے مکمل طور پر کسی علاج سے جواب دے دیا اور مجھے بے ہوشی میں گھر بھیج دیا۔ یہی حال چھوٹے ملازم کا بھی ہوا۔ یہ ''قتل'' میرے دو ملازموں نے میرے سوتے ہوئے کئے۔ ایک بھاگ گیا اور دوسرے کو محلّہ داروں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ میری سیف سے نکالے گئے آٹھ ہزار روپے بھی تھے۔ لیکن تب غازی آباد کے ایس ایچ او نے اس لڑکے کا چالان کرنے کی بجائے اسے اپنا ذاتی ملازم بنا کر گھر رکھ لیا اور میرا مقدمہ خرد برد کر دیا گیا۔ پولیس اور ملزموں کے ہاتھوں اس ظلم کے خلاف میں نے اپنے سب دوستوں سے مشورہ کر کے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ میرے بچپن کے ساتھی اور دوست مرشد نسیم نے' جو پریم گلی

کے رہائشی ہیں' میرا بہت ساتھ دیا اور جب سب علاج اور آپریشن بے سود ہو گئے تو پھر میری زندگی کا راستہ خودکشی کی طرف چلا گیا لیکن میں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ میں ایسے نوجوانوں' جو گھروں سے بھاگ کر داتا دربار' مینارِ پاکستان اور منڈی میں آتے ہیں' سالوں رہتے ہیں' یہاں پر وارداتیں کرتے ہیں' بدفعلی کراتے ہیں' ملازم بن کر لوگوں کے ساتھ جاتے ہیں اور چوریاں اور قتل کر کے بھاگ جاتے ہیں ان سے اپنے "قتل" اور اس حالت کا بدلہ لینے کے لئے انہیں ختم کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے لئے مرشد نے نمک کا تیزاب' زہر سائنائڈ اور گندھک کا تیزاب فراہم کیا۔ سولہ کین اور تین ڈرم پلاسٹک کے دئے۔ پہلا قتل یاسر نامی چودہ سالہ لڑکے کا کیا جو حافظ آباد کا رہنے والا تھا اس کے منہ پر زہر سائنائڈ اور گندھک سے پیدا کی ہوئی گیس کا ماسک لگا دیا دس سیکنڈ بعد ختم ہو گیا تو ڈرم میں ڈال کر تیزاب ڈال دیا ستر کلو تیزاب ایک سو چالیس روپے کا ملا جو ایک ہی رات میں لاش کو پانی بنا گیا جسے میں نے گٹر میں ڈال دیا۔ یہ تجربہ سو فیصد کامیاب ہوا۔ پھر ہر روز انسانوں کو ختم کر کے لاشیں پانی ہوتی رہیں۔ یہ لوگ جو گھروں سے بھاگے ملتے ان کے قتل کے بعد کوئی شور بھی نہ اٹھتا۔ چھ ماہ تک خون کی ہولی کھیلی گئی۔ سب دوست جن کے مشورے سے کام شروع کیا گیا تھا انہوں نے اسے مکمل کرنے تک میرا پورا ساتھ دیا۔ اس کام کی کامیابی کے باعث یہ انتقام کا جذبہ لوگوں کے لئے تفریح بن گیا۔ کسی نے جذبہِ انتقام میں میرا ساتھ دیا' کسی نے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے میرا ساتھ دیا۔ کسی نے روپوں کے لالچ میں ساتھ دیا کسی نے بدکاری کے شوق میں میرا ساتھ دیا۔ میں مکمل طور پر اپاہج اور لاغر ہو چکا تھا۔ نہ درست طور پر دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی سہارے کے بغیر چل سکتا تھا۔ کئی آپریشن کرانے کے بعد بھی میری کھوپڑی جگہ جگہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ ریڑھ کی ہڈی فریکچر ہے۔ کھڑا ہو جاؤں تو کسی طرف بھی گر سکتا ہوں کیونکہ میرا دماغ بیلنس نہیں ہے۔ ہر لمحہ دنیا چکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

میں قریب المرگ تھا۔ مجھے اس اذیت ناک زندگی تک دو ملازموں نے پہنچایا تھا جو یادگار اڈہ سے ملے تھے۔ ایک بنوں کوہاٹ کا پٹھان تھا دوسرا ناروال کا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ مالش بھی کرتا تھا۔ میں نے ان گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکوں کے بدلے گھروں سے بھاگے ہوئے درجنوں لوگ اوپر پہنچا دئے جہاں پہنچانے کی خواہش ان دونوں کی تھی۔ بیس جون سے تیرہ نومبر تک خدا نے میری دعاؤں کے مطابق گنتی 100 پوری کر دی اور یہ سارا کام بغیر کسی پریشانی کے کر دیا جس کے بعد میں نے اپنا سر خدا کے حضور گرا دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے قتل کا خدا نے دنیا سے بھرپور بدلا لے لیا ہے۔ میں گزشتہ ایک سال سے خدا سے یہی دعا کرتا رہا تھا کہ میری جان کے بدلے 100 جان لینے کی مجھے طاقت دے۔ میرے دوستوں کو خدا نے توفیق دے کر بھیجا اور میرے ملازموں نے میرا ساتھ دیا۔

خدا نے ہر طریقہ سے میری خواہش پوری کر دی۔ میں نے یہ خواہش اس لئے پوری کی تا کہ آئندہ کوئی ملازم کسی مالک کا قتل نہ کر سکے۔ میں نے اپنی ماں کو اپنے سرہانے بیٹھے راتوں کو روتے اور میری صحت کے لئے صدقے دیتے دیکھا تھا۔ جب میں ٹھیک نہ ہو سکا اور کاروبار کے قابل نہ رہا تو میری زندگی لاش سے بدتر ہوگئی۔ تب میری ماں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ 26 جولائی 1999 کو چل بسی۔ وہ آخری دم تک میری ہی باتیں کرتی رہی۔ اسی وجہ سے میں نے دوسرے شہروں کو چھوڑ کر چلے آنے والوں کا خاتمہ کرنے کی خواہش کی تا کہ ان کی مائیں بھی روتی رہیں۔ یہ لوگ بچپن سے جوانی تک مجرمانہ زندگی گزارنے والے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو میری ان حرکتوں اور شہر سے غائب ہونے کا پتہ چل چکا ہے۔ وہ اب میری زندگی کی پرواہ نہیں کریں گے حالانکہ انہیں کوئی شک نہیں کہ میں سب کچھ پولیس تک پہنچا دوں گا۔ مگر میں اپنے نفس اور ذہن سے مجبور ہوں اتنی بڑی کامیابی کو میں دنیا کو بتائے بغیر نہیں جا سکتا۔

57 لوگوں کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ ساتھ نام اور پتے اور

تاریخ جس میں کاروائی مکمل ہوئی۔ڈی آئی جی صاحب لاہور کو اعتماد میں لے کر اپنی مکمل ڈائری اور کاپی کے 32 صفحات بھیجنا چاہتا ہوں۔ یہ میں بذریعۂ ڈاک روانہ کر رہا ہوں۔ روزنامہ ''جنگ'' اور ایس پی سی آئی اے کی خدمت میں 57 رنگین تصاویر' ایڈریس' پتے' نام اور تاریخ بھجوا رہا ہوں۔وقتِ ضرورت خود کو بھی پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ ہے کیونکہ میں موت سے نہیں ڈرتا مگر یہ سوچتا ہوں کہ اپنے دوستوں کا جرم اپنے اوپر لے کے سزا لے لوں کیونکہ انہوں نے میرے کہنے پر یہ عمل کیا ہے۔خدا کرے میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاؤں۔آمین! اب خدا حافظ۔

والسلام۔ جاوید اقبال

==========

گیارھواں باب ... بے چینی کے دن رات

جاوید اقبال کا پولیس کو خط پڑھ کر میرے ذہن میں بہت سے اور سوالات ابھرے اور ان کا جواب تلاش کرنے کے لئے میں نے جاوید اقبال کے بڑے بھائی پرویز اقبال کو دوبارہ فون کیا اور ان کا انٹرویو کرنے چلا گیا تا کہ جاوید اقبال کے ہسپتال داخل ہونے کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرسکوں۔ پرویز اقبال پہلے کی طرح بڑی عزت سے ملے اور بڑی بے تکلفی سے جو کچھ ان کے خاندان پہ بیتی سنانے لگے۔

''ایک دن میں اپنی بلڈنگ کی دوسری منزل پر مرمت کا کام کر رہا تھا کہ گھر کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی اور اس میں سے کچھ لوگ اترے۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے'' نیچے آؤ''۔ جس طرح وہ مجھ سے مخاطب ہوئے میرا ماتھا ٹھنکا۔'' یہ کہیں سادہ لباس میں پولیس والے تو نہیں ہیں؟''۔ میں نے سوچا۔ چنانچہ میں پہلی منزل پر آ کر رک گیا۔

''کیا تم اس کار کو پہچانتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''جاوید اقبال تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''وہ میرا بھائی ہے''

''تم کیسے بھائی ہو۔ اپنے بھائی کی کار بھی نہیں پہچانتے؟''

اس لمحے مجھے ماضی کے پولیس کے تلخ واقعات یاد آ گئے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں تو وہ کہنے لگے'' یہ جاوید اقبال کی کار ہے۔ اسے کسی نے گولی ماردی ہے اور وہ ہسپتال میں ہے''۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن میں اتنا گھبرا گیا کہ میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد میرے چھوٹے بھائی سعید اور جاوید اقبال کے ملازم یاسین نے آ کر بتایا کہ جاوید اقبال واقعی ہسپتال میں ہے۔ چنانچہ میں سعید کے ساتھ ہسپتال گیا تا کہ حالات کا خود جائزہ لے سکوں۔ ہسپتال میں داخل ہوا تو نہ صرف مجھے وردی پہنے پولیس والے نظر آئے بلکہ وہ لوگ بھی نظر آئے جو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ جب میں ان کے قریب سے گزرا تو ایک مرد نے دوسرے سے کہا ''یہ جاوید اقبال کا بھائی ہے۔ اسے گرفتار کرلو''۔ جب میں نے یہ سنا تو میں اور بھی گھبرا گیا اور سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ پھر وہ مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ان کو شک تھا کہ جاوید اقبال پر اس کے بھائیوں نے حملہ کیا ہے۔ میں نے کہا ہم اپنے بھائی جاوید اقبال کو ہسپتال میں دیکھنے آئے ہیں ہم پولیس سے بات چیت بعد میں کریں گے۔ وہ راضی ہو گئے اور مجھے چھوڑ دیا۔

میں سارے وارڈ میں گھوم آیا لیکن مجھے جاوید اقبال نظر نہ آیا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے اس بستر کی طرف اشارہ کیا جس پر جاوید اقبال لیٹا ہوا تھا۔ اس کی شکل مار پیٹ سے اتنی مسخ ہو چکی تھی کہ میں اسے پہچان بھی نہ پایا۔ اس کا چہرہ سوجھا ہوا تھا اور اس نے صرف ٹی شرٹ اور جانگیہ پہن رکھا تھا۔

اس کے جسم سے خون کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی شکل اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر مجھے چکر آنے لگے۔ ڈاکٹر نے میری حالت دیکھی تو مجھے وارڈ سے باہر لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ جاوید اقبال کی حالت اتنی خراب ہے کہ وہ جلد مر جائے گا۔ اس کا زندہ رہنا ایک معجزہ ہوگا اور اگر وہ زندہ رہا بھی تو ذہنی طور پر مفلوج ہوگا۔

وارڈ کے باہر جب ہماری پولیس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو ہم نے شام کے وقت پولیس سٹیشن جانے کا وعدہ کرلیا۔ شام کو جب ہم پولیس سٹیشن گئے تو انہوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم رپورٹ لکھوائیں اگرچہ ہم اس واقعہ کے عینی شاہد نہیں تھے۔ ہم پولیس سے تعاون کرتے رہے۔

ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ ہم پر اپنے بھائی کے قتل کا الزام نہ لگا دیں۔ کاغذات دستخط کرنے کے بعد ہم گھر آ گئے۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ جاوید اقبال کے ساتھ ایک بارہ سالہ لڑکا بھی زخمی ہوا تھا اور وہ میو ہسپتال میں داخل تھا۔ ہم دونوں کی مزاج پرسی کے لئے جایا کرتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ وہ دونوں زندہ بچ جائیں تا کہ حقیقت پولیس کے سامنے آئے اور ہم پر قتل کا جھوٹا الزام نہ لگے۔

تین ہفتوں کی بیہوشی کے بعد جاوید اقبال کو ہوش آیا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ جاوید اقبال کے سر اور جبڑے کی ہڈیاں کئی جگہوں سے ٹوٹ چکی تھیں۔ جنرل ہسپتال نے اسے ڈسچارج کیا تو ہم اسے ڈنٹل ہسپتال لے گئے لیکن انہوں نے بھی ہماری مدد نہ کی بلکہ ہم سے جانوروں کا سا سلوک کیا۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم کسی پرائیویٹ ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ ہم نے مشورہ کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اس کے ابتدائی علاج پر 95 ہزار روپے خرچ آئے گا جو ہماری استطاعت سے باہر تھا۔

پھر کسی نے مشورہ دیا کہ ہم سروسز ہسپتال جائیں جہاں ہماری ملاقات ڈاکٹر کاشف سے ہوئی۔ وہ ایک ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔ وہ ہم سے بہت اچھی طرح پیش آئے۔ انہوں نے جاوید اقبال کے جبڑے پر آپریشن کیا۔ اس آپریشن کی فیس ادا کرنے کے لئے جاوید اقبال کو اپنا گھر بیچنا پڑا۔

جب وہ بارہ سالہ لڑکا ارباب صحت یاب ہوا تو اس نے جاوید اقبال پر جنسی بدفعلی کا الزام لگا دیا۔ اس الزام کو رفع دفع کرنے کے لئے جاوید اقبال نے لڑکے کے والد کو رقم دی اور اسے اپنے گاؤں بھیج دیا۔ چونکہ جاوید اقبال کے پاس زیادہ رقم نہ بچی تھی اس لئے ہماری اماں نے اس کی مدد کی۔

اس دوران ہماری ملاقات جاوید اقبال کے پرانے ملازم اقبال سے ہوئی۔ جب اماں

نے اقبال کو کہانی سنائی تو وہ ان کے ساتھ چلا آیا اور جاوید اقبال کی خدمت کرنے لگا۔ ان دنوں اماں کی صحت اچھی نہ تھی۔ انہیں دل کے مسائل بھی تھے اور وہ ہماری بہن کے بارے میں بھی پریشان رہتی تھیں جس کی طلاق ہو چکی تھی۔ اماں اسی بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ اماں نے اقبال کو جاوید اقبال کی خدمت کرتے دیکھا تو سوچا کہ اپنی بیٹی کی شادی اقبال سے کر دیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس سلسلے میں جاوید اقبال سے جا کر مشورہ کروں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں جاوید اقبال سے ملنے راوی روڈ گیا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں بعد میں سو بچوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔

راوی روڈ کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ سامنے ایک برآمدہ تھا اور پھر ایک لمبا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے اندر ایک اور کمرہ اور اس کمرے کے اندر ایک اور کمرہ تھا۔ مجھے وہاں کوئی بڑا گٹر نظر نہ آیا۔ اس گھر کی ساخت ایک پیالے کی طرح تھی اور ہمسائے اس گھر کے صحن میں جھانک سکتے تھے۔ اگر کوئی اس گھر میں چیختا بھی تو ہمسایوں کو فوراً خبر ہو جاتی۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا اس گھر میں سو بچے قتل ہوں اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو"۔

میں نے پرویز اقبال سے کئی موضوعات پر تبادلہِ خیال کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جاوید اقبال نے سو بچوں کو قتل نہیں کیا۔ میں نے گھر آ کر جاوید اقبال کی ڈائری کو دوبارہ پڑھا۔ مجھے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ جاوید اقبال نے اپنی کہانی میں حقیقت اور فکشن کو اتنا خلط ملط کر دیا تھا کہ انہیں جدا کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ جاوید اقبال کہیں ذہنی طور پر اتنا متاثر تو نہ ہوا تھا کہ اس کے ذہن میں واقعات گڈمڈ ہو گئے ہوں۔ بائیس دن بیہوش رہنے سے اس کا دماغ مفلوج ہو سکتا تھا۔

میں نے اس کی ڈائری کو تنقیدی نگاہ سے سے ازسرِ نو پڑھنا شروع کیا۔ اس نے ڈائری میں لکھا تھا کہ اسکی بیٹی اور بیوی اس سے جیل میں ملنے آئے تھے اور پھول لائے تھے جو پولیس کی رپورٹ کی بنا پر جھوٹ تھا۔ اس کی ملاقات اپنی بیوی اور بیٹی سے برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔

میرا ماتھا اس وقت بھی ٹھنکا جب میں نے جج کے فیصلے میں یہ پڑھا ''یہ بات واضح ہے کہ اس کیس میں کوئی معروضی شہادت نہیں ہے۔ ملزم کے وکیل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عینی شہادت کی غیر موجودگی میں ملزم بے گناہ ہے۔ چونکہ کوئی بھی مردہ جسم نہیں پایا گیا اس لئے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ بچے کس طرح مرے۔ ملزم کے وکیل نے یہ بھی کہا کہ وکیلِ استغاثہ جرم ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔''

میں نے ایک مقامی رسالے ''غازی'' کے 4 جنوری 2000 کے شمارے میں یہ خبر بھی پڑھی کہ جن سو بچوں کے قتل کی سزا جاوید اقبال کو ملی تھی ان میں سے تین گمشدہ بچے بخیر و عافیت گھر واپس آ گئے تھے۔

آخر میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں جاوید اقبال کی ڈائری میں سے ایک واقعہ لوں اور اپنے محدود ذرائع سے خود اس کی تحقیق کروں۔ جب میں نے نومبر کی ڈائری پڑھی تو اس میں جاوید اقبال کے اس بھتیجے کا ذکر تھا جس سے میں اس وقت مل چکا تھا جب میں اس کے والد کا انٹرویو لینے گیا تھا۔

جاوید اقبال نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

''6 نومبر۔ آج میرے تینوں بھتیجے وسیم پرویز، شہباز اعجاز اور نومی جبار پانچ بجے شام کو ایک بہت خوبصورت سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ یہاں آ گئے۔ لڑکی بہت پریشان تھی۔ مجھے علیحدہ ہو کر وسیم نے کہا کہ انکل ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ہمیں بچاؤ۔ میں نے پوچھا تو کہا کہ یہ لڑکی ہمارے گھر میں کام کرنے والی لڑکی کی سہیلی ہے اور کسی گاؤں سے گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ ہم نے اسے نوکرانی کے طور پر ایک ہفتہ گھر میں رکھا۔ یہ اس دوران مجھ (وسیم پرویز) سے سیٹ ہو گئی۔ میں نے اسے نومی اور شہباز سے بھی ملوایا۔ سب مل کر اس لڑکی کو استعمال کرتے

رہے۔ پھر یہ چلی گئی۔ اب تین ماہ بعد آئی ہے اور کہتی ہے مجھے بچہ ہونے والا ہے کچھ کرو ورنہ میں اپنے والدین کو لا کر مقدمہ کروں گی۔ تم مجھ سے شادی کرو۔ میں اسے یہاں لایا ہوں آپ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ دشمنوں کو ختم کرنے میں آپ مدد کر رہے ہیں۔ اس لڑکی سے ہماری جان چھڑائیں۔ میں نے ہاں کر دی مگر اسی اثنا مجھے ساجد نے بتایا کہ ملازم لڑکے شہزاد نے آپ کی باتیں دوسرے کمرے میں بیٹھ کر سن لی ہیں اور مجھے بتایا ہے کہ بھائی جان اس لڑکی کو مارنے والے ہیں۔ میں نے شہزاد کو جو جھنگ کا ہے یہاں رکھ کر دوسرے لڑکے کو ساجد کے ساتھ باہر بھیج دیا اور وسیم کو زنجیر دے کر کہا کہ لڑکی کی گردن میں اچانک پیچھے سے ڈال کر کھینچ دو اور خود لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ وسیم پیچھے کھڑا رہا۔ شہزاد دوسرے کمرے میں تھا۔ دروازہ ہم نے بند کر دیا تھا۔ اب وسیم نے اچانک زنجیر ڈال کر لڑکی کا سانس بند کر دیا۔ بہت تڑپی مگر شہباز اور نومی نے میرے ساتھ اس کو قابو رکھا اور ٹی وی کی بلند آواز میں اسے ختم کر دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ میرے ملازم شہزاد کو بھی، جو بے حد خوبصورت لڑکا ہے، ختم کر دو۔ وسیم نے اسے بھی پکڑ کر زبردستی زنجیر ڈالی اور اسے بھی تینوں نے بڑی مشکل سے ختم کر دیا۔ اب دونوں لاشوں کو میں نے ان کے ساتھ ڈرموں میں رکھ کر تیزاب تینوں سے ڈلوایا اور کام ختم کر دیا۔ ان کے سامنے لڑکی اور شہزاد کی تصویریں نہیں بنا سکا۔ میں نے لڑکی کا اتہ پتہ بھی ان کے سامنے نہ پوچھا۔ تینوں یہ دو قتل کر کے بہت خوش اور دلیر ہوئے۔ میں نے سمجھایا کہ تیزاب کی بات کسی سے نہ کرنا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ عمل کریں گے اور چلے گئے۔'

ڈائری پڑھ کر میں نے وسیم کو فون کیا اور انٹرویو کی درخواست کی۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں شعیب کو لے کر دوبارہ شادباغ گیا۔ وسیم بڑے خلوص سے ملا۔ کہنے لگا کہ اسے ہمیشہ ایک ایکٹر بننے اور انٹرویو دینے کا شوق تھا۔ ہم کچھ دیر ڈراموں اور فلموں کی باتیں کرتے رہے پھر میں نے اس سے جاوید اقبال اور پولیس کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''ایک دن پولیس افسر ہمارے گھر آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے ''تم کون ہو؟'' میں نے کہا ''وسیم'' کہنے لگے ''ہمارے ساتھ چلو''۔ میری اماں نے پوچھا ''میرے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہو؟''

کہنے لگے ''ہم نے اس سے ایک کیس کے بارے میں تفتیش کرنی ہے۔ اسے پولیس سٹیشن لے جا رہے ہیں''۔ میں یہ سن کر گھبرا گیا کیونکہ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ وہ کس کیس کی بات کر رہے ہیں۔ وہ مجھے راوی روڈ کے پولیس سٹیشن لے گئے اور مجھے کالر سے پکڑ کر اندر گھسیٹا۔ پھر دو انسپکٹروں نے مجھے مارا پیٹا۔ وہ مجھ سے ایسا سلوک کر رہے تھے جیسے کہ میں کوئی مجرم ہوں۔ پھر دو افسر پرویز قندھاری اور طارق محمود آئے اور مجھے جیپ میں بٹھا کر قلعہ گوجر سنگھ لے گئے۔ میں ایک انسپکٹر سے ملا تو اس نے مجھ سے پوچھا ''تمہارا کیا نام ہے؟''

''وسیم'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارا جاوید اقبال سے کیا رشتہ ہے؟''

''وہ میرا چاچو ہے''

ہم نے بچپن میں سنا تھا کہ جاوید اقبال چاچو نے کچھ ایسے خلافِ قانون کام کئے تھے کہ میرے ابو اور دادا جان کو پولیس سٹیشن جانا پڑا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے چاچو نے پھر کوئی ایسا ہی کام کیا ہو۔

پھر انسپکٹر نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اس سے کہا کہ میری تفتیش کرے۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا اور اس نے مجھے بتایا کی جاوید اقبال نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ میں نے ایک لڑکی کو قتل کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ میرے چاچو نے یہ مجھ پر الزام لگایا تھا۔ اس الزام میں میرے کزن شہباز اور ندیم بھی شامل تھے۔ کانسٹیبل نے یہ بھی کہا کہ ڈائری میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے اس لڑکی کے ساتھ جنسی تعلقات تھے اور وہ حاملہ تھی جب

ہم قتل کرنے کے لئے اسے اپنے چاچو کے پاس لے گئے تھے۔

''مجھ پر کس جرم کا الزام ہے؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''کہ تم نے ایک لڑکی کو قتل کیا ہے''۔

پھر کانسٹیبل نے مجھے ایک چھڑی سے مارا اور واپس انسپکٹر کے دفتر میں لے گیا۔ اتنی دیر میں طارق کمبوہ بھی آ گیا۔ اس نے مجھے روتے دیکھا تو مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں میرے ابو اور دو چچا موجود تھے۔ اس نے مجھے ان کے پاس چھوڑا اور خود چلا گیا۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پولیس جاوید اقبال کو ڈھونڈ رہی تھی اور انہوں نے ہمیں گرفتار کر لیا تھا۔ انہوں نے ہمیں حوالات میں رکھا اور بہت مارا پیٹا۔ انہوں نے بار بار ہم سے سوالات کر کے ہمیں پریشان کیا۔ وہ رات کو ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تھے۔ ہم پر حوالات میں بہت سخت وقت گزرا تھا۔ ہمیں پولیس نے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔''

وسیم کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا قتل حقیقت نہیں افسانہ تھا اسی لئے پولیس نے وسیم اور اس کے والد کو چھوڑ دیا تھا۔ وسیم کو انٹرویو کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ جاوید اقبال نے اپنی حرکات کی وجہ سے سارے خاندان کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔ میں ان کا بہت ممنون تھا کہ اتنی مشکلات سے گزرنے کے باوجود وہ مجھ سے پوری طرح تعاون کر رہے تھے۔ وہ نہایت نیک اور ایماندار لوگ تھے۔

میں نے وسیم سے گفتگو ختم کی تو جاوید اقبال کا چھوٹا بھائی سعید کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے سعید سے جاوید اقبال کے بارے میں اس کے خیالات پوچھے تو وہ کہنے لگا۔

''میں ابھی چھوٹا ہی تھا تو جاوید اقبال گھر سے جا چکا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ایک زمانے میں وہ شاد باغ مارکیٹ ایسوسی ایشن کا ایک فعال سماجی کارکن تھا۔ پھر اس نے وڈیو گیمز کا کاروبار شروع کر دیا۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا اس کے

اردگرد چھوٹی عمر کے لڑکے ہوا کرتے تھے۔اس نے ایک سکول بھی شروع کیا تھا جسکا نام سنی سائڈ سکول Sunnyside School تھا۔وہ شادباغ کے علاقے میں بچوں کا پہلا ائرکنڈیشنڈ سکول تھا۔''

''جب جاوید اقبال کا واقعہ منظرِ عام پر آیا تو آپ کو کیا محسوس ہوا؟''

''ہم کیا محسوس کرتے؟ وہ سب کے لئے ایک المیہ تھا۔ہم نے سب کچھ اخباروں اور رسالوں میں پڑھا کیونکہ اس سے تو ہماری ملاقات ہی نہ ہوتی تھی''۔

''آپ آخری دفعہ اس سے کب ملے تھے؟''

''وہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور مجھے بتانے لگا کہ اس نے ایک ایسا فارمولا تلاش کیا ہے جس سے وہ ساری دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا۔اس وقت اس نے لڑکوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔میں نے اس سے کہا کہ انسانوں کی زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔پھر وہ چلا گیا اور میں نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا''۔

''جب آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس کی ذہنی کیفیت کیسی تھی؟''

''میرا خیال تھا کہ چونکہ اس کے سر اور جبڑے کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور سر پر بہت سی چوٹیں لگی تھیں تو شاید وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔''

''اس کی جسمانی صحت کیسی تھی؟''

''میں نے اسے کئی دفعہ لڑکوں کے کندھوں کا سہارا لے کر چلتے دیکھا تھا۔اسے والدہ کی موت نے بہت پریشان کیا تھا۔وہ 26 جولائی 1999 کو فوت ہوئی تھیں۔وہ سولہ دن جو وہ ہسپتال میں رہی تھیں وہ ہر روز ہسپتال آتا تھا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا تھا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ والدہ کے کمرے کے اندر نہیں باہر بیٹھا رہتا تھا۔والدہ کی وفات کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔پھر کچھ عرصہ بعد وہ اخباروں میں دکھائی دینے لگا اور اس کی کہانی ملک کے بچے بچے کی

زبان پر تھی۔"

"اس پورے واقعہ نے آپ کے خاندان کو کیسے متاثر کیا ہے؟"

سعید نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا" ڈاکٹر صاحب! کیا پوچھتے ہیں۔ہم عجیب عذاب میں زندگی گزار رہے ہیں۔ہم دوسروں کی نگاہ میں اپنی عزت کھو چکے ہیں اور ہمارے بچوں کا مستقبل تباہ ہو گیا ہے۔سکولوں نے ہمارے بچوں کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ہم سب اس کے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔اس سب واقعہ میں بھلا ہمارا کیا قصور ہے۔جو لوگ سمجھدار ہیں انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم معصوم ہیں لیکن بعض لوگ ہم سے بہت ظالمانہ سلوک کر رہے ہیں۔ہمارے خاندان نے کبھی قانون شکنی نہیں کی۔یہ گھرانہ اتنا شریف ہے کہ یہاں کوئی گالی تک نہیں دیتا"۔

"جاوید اقبال کی شخصیت کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟"

"وہ بہت ذہین انسان ہے۔ہمت کا پکا ہے۔اگر وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو پورا کر دکھاتا ہے چاہے وہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔وہ جھوٹ بہت بولتا ہے اور چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔وہ جو بھی کہانیاں سناتا ہے اس میں سے 99 فیصد جھوٹی ہوتی ہیں"۔

اس گفتگو کے بعد میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا آیا۔

میرے لئے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف جاوید اقبال نے پولیس اور میڈیا کو خط لکھتے ہوئے اعترافِ جرم کیا تھا اور دوسری طرف عدالت میں ان جرائم سے انکار کر دیا تھا۔میں سوچتا رہا کہ آخر اس نے ایسا کیوں تھا۔چنانچہ میں نے دوبارہ جاوید اقبال سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اس سے انٹرویو لینے پھانسی گھاٹ پہنچ گیا۔اس دفعہ وہ کافی افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔میں نے زیادہ وقت ضائع کئے بغیر پوچھا" آپ پولیس کو خط لکھنے کے بعد ایک مہینے کے لئے غائب ہو گئے تھے۔پولیس بھی آپ کو نہ پکڑ سکی۔آپ کہاں چھپے رہے؟"

''میں ایک مہینہ جنگلوں میں رہا۔آخر میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ چنانچہ میں خود اخبار کے دفتر پہنچ گیا اور اپنے آپ کو پیش کر دیا۔اس دوران میں نے خودکشی کا فیصلہ بھی کیا تھا۔میں ایک دن راوی دریا کے کنارے بھی گیا تھا اور سوچا تھا کہ ڈوب کر مر جاؤں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔میں نے سوچا کہ اگر میں مر گیا تو میری کہانی کون سنائے گا۔ میں ان سینکڑوں بچوں کی کہانی ساری دنیا کو سنانا چاہتا تھا جن پر پاکستان میں ظلم کیا جاتا ہے اور ان مظالم میں پاکستانی پولیس پیش پیش ہے۔ میں ساری دنیا کو پولیس کے مظالم کی کہانی سنانا چاہتا تھا اس لئے میں نے خودکشی نہیں کی۔میں ان تمام پولیس افسروں کو جانتا ہوں جو بچوں پر مظالم کرتے رہے ہیں''۔

''اب آپ مجھے سچ سچ بتائیں کیا آپ نے سو بچوں کو قتل کیا تھا؟''

اس نے سیدھا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا'' کیا آپ کا خیال ہے کہ ایک ایسا انسان جو نہ تو چل پھر سکتا ہو نہ غسل خانے تک جا سکتا ہو اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ سو بچوں کو قتل کر سکے؟''۔

''کیا آپ نے بچوں پر ظلم کیا تھا؟''

''میں بچوں سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ان کی تعلیم کے لئے ایک خاص ائرکنڈیشنڈ سکول بنایا تھا۔میں نے ان کی تفریح کے لئے وڈیو سنٹر بنایا تھا۔میں نے ہمیشہ بچوں کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔میں انہیں مظالم سے بچانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔مجھ پر ہمیشہ غلط الزامات لگائے گئے ہیں''۔

''اگر آپ نے بچوں کو قتل نہیں کیا تو پھر آپ کے لڑکوں نے پولیس کے سامنے اعتراف کیوں کیا؟''

''آپ نے ضرور میرے ساتھی اسحاق بلا کی کہانی سنی ہو گی اگر نہیں سنی تو اس کی تفاصیل

پڑھنے کی کوشش کریں۔ پولیس کو پتہ تھا کہ وہ میرا ساتھی ہے اس لئے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوسرے ساتھی بھی قتل ہو جائیں اس لئے میں نے انہیں کہا تھا کہ پولیس جو بھی الزام لگائے تم مان جانا کیونکہ زندہ بچنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ سب اعتراف جھوٹے ہیں ان میں حقیقت ذرا بھی نہیں۔ ہم نے قتل نہیں کئے''۔

''اگر آپ نے قتل نہیں کئے تو پھر آپ نے اخبار کے دفتر جا کر اعتراف کیوں کیا تھا۔ ایک جھوٹی کہانی کیوں سنائی تھی؟''۔

''ڈاکٹر سہیل! اس ملک میں ساری عمر گزارنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس ملک کا نظام اتنا خراب ہو چکا ہے کہ وہ اندر سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام صرف اس وقت ٹھیک ہو گا جب بین الاقوامی ادارے اس طرف دھیان دیں گے اور بین الاقوامی توجہ حاصل کرنے کے لئے مجھے ایک بہت بڑے ڈرامے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے سو بچوں کے قتل کا ڈرامہ رچایا اور اس میں کامیاب رہا۔ اسی لئے میں آپ کو یہ ساری کہانی سنا رہا ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ یہ کہانی ساری دنیا کو سنائیں گے۔ آپ دنیا کو بتائیں گے کہ ہمارا نظام کتنا خراب اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! ہمارا نظام کرپٹ نظام ہے۔ وہ چاہیں تو مجھے قتل کر دیں لیکن جب تک یہ نظام ٹھیک نہیں ہو گا اور حالات نہیں بدلیں گے یہاں ایک اور جاوید اقبال پیدا ہو گا۔'' اس کے بعد اس نے منہ موڑا اور تسبیح پھیرنے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے الوداع کہا اور واپس چلا آیا۔

==========

بارھواں باب ... پولیس اور جرائم

جاوید اقبال سے انٹرویو لینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں کیوں نہ اسحاق بلا کی کہانی کی تفاصیل جاننے کی کوشش کروں ہوسکتا ہے کہ وہ بھی اس گتھی کو سلجھانے میں مدد کرے۔ جب میں نے اخباروں میں تفصیل پڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اسحاق بلا کے واقعہ میں پولیس ملوث تھی۔ جب جاوید اقبال 2 دسمبر 1999 کو غائب ہوگیا تھا تو پولیس نے جاوید اقبال کے ساتھ جن لڑکوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا ان میں اسحاق بلا بھی شامل تھا۔ جب انہیں اسحاق بلا نہ ملا تو اس کے والد کو پکڑ کر لے گئے جس طرح انہوں نے جاوید اقبال کے معصوم باپ اور بھائیوں کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔ 6 دسمبر 1999 کو اسحاق بلا کی ماں خود اسحاق بلا کو پولیس کے حوالے کیا تا کہ اپنے خاوند کو چھڑوا سکے۔ 8 دسمبر کو خبر چھپی کہ اسحاق بلا نے پولیس سٹیشن کی دوسری منزل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ اسحاق بلا کے خاندان کو اس خبر کی صحت پر یقین نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسحاق بلا کی موت میں پولیس کا ہاتھ ہے۔

جب میں خضر حیات گوندل کی کتاب ''100 بچوں کا قتل'' پڑھ رہا تھا تو اس میں مجھے یہ لکھا ملا:

''سو بچوں کی مبینہ قتل کیس کا اہم کردار اسحاق عرف بلا پولیس حراست میں ہلاک ہو گیا۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ پولیس نے بتایا کہ تفتیش کے دوران اس نے ایک دم کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔''

طارق کمبوہ کے بیان کے مطابق ملزم نے سو بچوں کے قتل کا راز کھلنے کے خوف سے خودکشی کی ہے۔ متوفی کے لواحقین کے مطابق پولیس نے اس پر یا تو تشدد کر کے ہلاک کیا اور لاش کھڑکی سے باہر پھینک دی یا پھر اس کی حالت غیر ہونے پر اسے مار دیا گیا۔

چیف سیکرٹری پنجاب حفیظ اختر نے کہا ہے کہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ سو بچوں کے مبینہ قاتل جاوید اقبال کے ساتھی اسحاق بلا کو پولیس نے ساتھیوں کو بچانے کے لئے مار دیا ہو۔

گورنر پنجاب نے کہا کہ موجودہ حکومت اس طرح کے واقعات کی کبھی اجازت نہیں دے گی۔

چیف سیکرٹری پنجاب نے کہا کہ اسحاق بلا' ڈی ایس پی طارق کمبوہ' اے ایس آئی شاہد مراد اور سپاہی کے پاس تھا... اس لئے تحقیقات ہو رہی ہیں اور پیش بندی کے طور پر پولیس کے افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

سی آئی اے پولیس کی حراست میں ہلاک ہونے والے اسحاق بلا کے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اسحاق کی موت سر کی چوٹ سے واقع ہوئی ہے۔ اسحاق بلا کے سر میں لگنے والی چوٹ کو میڈیکل بورڈ نے Egg Shell Fracture سے مماثلت دی ہے۔ میڈیکل بورڈ کے مطابق اسحاق بلا کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے اور اس کے علاوہ پاؤں اور کندھوں پر سوزش تھی۔ اس کے جسم پر زخموں کے ۱۷ نشانات تھے جن میں سے ۹ زخم ایک دن سے تین دن تک پرانے تھے۔ اسحاق بلا کا پوسٹ مارٹم سات رکنی ڈاکٹروں کے بورڈ نے کیا تھا'

جب میں نے جج کا بیان دوبارہ پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جج کو بھی اندازہ تھا کہ پولیس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا جس کی اس نے ان الفاظ میں مذمت کی تھی۔

''جاوید اقبال کے گھر سے جو ہڈیاں نکلی تھیں وہ انسانی ہڈیاں نہیں تھیں۔ وہ ہڈیاں پولیس نے خود جا کر اس کے گھر میں رکھی تھیں۔ جبکہ پولیس کے ایک افسر نے جاوید اقبال کے گھر کو مقفل کر دیا تھا تو دوسرے پولیس افسر کے وہاں جانے کو کوئی جواز نہ تھا۔ میں پولیس کی اس قسم

کی حرکتوں کو غلط سمجھتا ہوں۔''

جج کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ پولیس کا گمشدہ بچوں کے والدین سے سلوک ہمدردانہ نہ تھا۔اس نے لکھا تھا ''پولیس نے گمشدہ بچوں کی تلاش میں نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔بچوں کے والدین نے مجھے بتایا کہ جب وہ پولیس کے دفتر میں اپنے گمشدہ بچوں کی رپورٹ لکھوانے گئے تو انہوں نے رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔یہ ایک تفتیش ناک بات ہے جس کی میں علیحدگی سے رپورٹ لکھ اصحابِ اختیار کو بھیجوں گا''۔

جب اسحاق بلا کے کیس کی مزید تفتیش ہوئی تو پتہ چلا کی اس میں پولیس خود ملوث تھی۔ خضر حیات لکھتے ہیں'' پنجاب کی حکومت نے سو بچوں کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں زیرِ حراست اسحاق عرف بلا کی ہلاکت پر ایس پی سی پرویز قندھاری' ڈی ایس پی طارق کمبوہ' ایس ایچ او امتیاز بھالی اور اے ایس آئی شاہد مراد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرنے کا حکم دے دیا ہے۔''

==========

تیرھواں باب ... نابالغ اور بالغ قاتل

جج کی کاروائی پڑھنے کے بعد میں نے عابد حسن منٹو کو ایک دفعہ پھر فون کیا اور پوچھا

''منٹو صاحب! جاوید اقبال کے ساتھ جن تین لڑکوں پر قتل کا الزام ہے وہ جسمانی طور پر تو بالغ ہیں لیکن ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہے۔ان میں سے ایک کو پھانسی کی سزا ملی ہے۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستانی قانون کے مطابق نابالغ اور بالغ مجرموں میں کیا فرق ہے؟''

منٹو صاحب نے فرمایا''پاکستان کے عمومی قانون کے مطابق شہریوں کو اٹھارہ سال کی عمر میں بالغ سمجھا جاتا ہے اور وہ روز مرہ کا، کاروبار کر سکتے ہیں۔لیکن جہاں تک penal code کا تعلق ہے اس کے مطابق سات سال کی عمر سے کم بچوں کو معصوم سمجھا جاتا ہے۔سات سے سترہ سال کی عمر کے بچوں کو جرم کی سزا مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ذہنی طور پر جانتے ہوں کہ انہوں نے جو کام کیا ہے وہ خلافِ قانون ہے اور انہیں اس کی سزا ملے گی۔ایسے حالات میں ذہنی بلوغت جسمانی بلوغت سے زیادہ اہم ہے۔اگر جج کسی نوجوان کو ذہنی طور پر بالغ سمجھتا ہو تو وہ اسے سزا دے سکتا ہے۔''

''جاوید اقبال نے اپنے بیانات میں خودکشی کا ذکر بھی کیا تھا۔پاکستانی قانون کی نگاہ میں خودکشی کو کیا حیثیت حاصل ہے؟''

''ڈاکٹر سہیل! پاکستانی قانون کی نگاہ میں وہ ایک جرم ہے۔اگر کوئی اقدامِ خودکشی کرتا ہے تو اس پر مقدمہ چلتا ہے اور وہ سزا پاتا ہے''۔

چودھواں باب ... ولی اور پاپی

ایک سہ پہر میں اور شعیب داتا گنج بخش کی قبر پر حاضری دینے گئے۔ وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں، جن میں عوام بھی شامل تھے خواص بھی، امیر بھی شامل تھے غریب بھی، لنگر سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ میں نے شعیب سے کہا کہ میری ماں جی بھی جب کبھی کوئی منت مانتی ہیں تو داتا دربار میں دو کالے بکرے قربانی کر کے غریبوں میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ میں داتا دربار پر حاضری دیتے ہوئے سوچتا رہا کہ جاوید اقبال کس طرح اس مقدس جگہ پر آ کر عبادت کرتا ہوگا اور پھر سو بچوں کو قتل کرنے کی دعائیں مانگتا ہوگا۔

داتا دربار پر حاضری دینے کے بعد میں اور شعیب بادشاہی مسجد کی سیر کرنے چلے گئے۔ وہ مسجد ہمیشہ کی طرح پرشکوہ دکھائی دے رہی تھی۔ شعیب مجھے مسجد کے اس عجائب گھر لے گیا جس میں ساری دنیا سے مذہبی نوادرات جمع کئے گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

بادشاہی مسجد کی سیر کے بعد ہم لاہور قلعہ دیکھنے چلے گئے جہاں مغلیہ خاندان کی بہت سی نشانیاں دکھائی دیں۔ شعیب نے مجھے بتایا کہ اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں جہانگیر اور نور جہان کے رشتے نے خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ نور جہان جہانگیر سے زیادہ زیرک تھی؟''

''نہیں۔ وہ کس طرح؟''

''میں آپ کو ان کے بارے میں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں''

''ضرور سناؤ''

''جہانگیر اور نور جہان ہر ہفتے جمعے کی شام کو سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن سیر

کے دوران وہ محل سے نکل کر ایک پہاڑی پر نکل آئے۔ جب وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے تو جہانگیر کو وادی میں ایک ایسی دیہاتن نظر آئی جو زمین پر لیٹ کر بچے کو جنم دے رہی تھی۔ جہانگیر نے نور جہان کی توجہ اس عورت کی طرف مبذول کروائی۔ اس عورت نے بچے کو جنم دیا' دو پتھروں سے آنول کو کاٹا' بچے کو پونچھ کر اپنی چادر میں لپیٹا اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔ جہانگیر کہنے لگا

''ملکہ صاحبہ! آپ نے دیکھا۔ یہ بھی ایک عورت ہے اور آپ بھی ایک عورت ہیں حاملہ ہوں تو بچے کی پیدائش سے پہلے اور بعد مہینوں ملازمائیں آپ کی خدمت کرتی رہتی ہیں''

نور جہان جو ایک جہاندیدہ عورت تھی جہانگیر کی طنز سن کر خاموش رہی۔

اگلے دن نور جہان نے اپنے محل کے مالی کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ محل کے پودوں کو پانی دینا بند کر دے۔

''ملکہ صاحبہ! کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا حکم دے رہی ہیں۔ بادشاہ سلامت نے ساری دنیا سے مختلف قسم کے نادر اور خوبصورت پھول منگوا کر باغ میں لگوائے ہیں۔ اگر ان پھولوں کو چند دن پانی نہ ملا تو وہ مرجائیں گے''۔ نور جہان کے اصرار پر وہ سر کھجاتا وہاں سے چلا گیا۔

اگلے ہفتے جب نور جہان اور جہانگیر دوبارہ سیر کرنے نکلے تو جہانگیر یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا کہ باغ میں اس کے پسندیدہ پھول مرجھا چکے ہیں۔ اس نے مالی کو بلوا کر غصے میں پوچھا

''یہ پھول مرجھا کیوں گئے ہیں؟''

''حضور! ملکہ صاحبہ کا حکم تھا کہ پھولوں کو پانی دینا بند کر دو''۔

جہانگیر نے نور جہان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ جب مالی چلا گیا تو جہانگیر نے غصے سے کہا ''کیا تم نہ جانتی تھی کہ پانی کے بغیر یہ سب پھول مرجھا جائیں گے؟''

''غصے میں مت آؤ'' نور جہان نے مسکراتے ہوئے کہا ''اس پہاڑی کی طرف دیکھو جس پر ہم پچھلے ہفتے سیر کے لئے گئے تھے۔اس پہاڑی پر سینکڑوں درخت اگے ہوئے ہیں۔ انہیں پانی کون دیتا ہے؟''

جہانگیر چند لمحے خاموشی سے سوچتا رہا پھر اسے اندازہ ہوا کہ نور جہان پچھلے ہفتے کے سوال کا جواب دے رہی ہے جب جہانگیر نے اس کا مقابلہ ایک دیہاتن سے کیا تھا۔اس دن جہانگیر کو اندازہ ہوا کہ نور جہان ان نازک پھولوں کی طرح ہے جن کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے شعیب اور میں یادگارِ پاکستان کے قریب پہنچ گئے۔ہم نے کوک کی بوتلیں اور پکوڑے خریدے اور گھاس پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ہمارے سامنے بہت سے گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے گھوم پھر رہے تھے۔مجھے اچانک خیال آیا کہ ہم اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں جج نے جاوید اقبال کو برسرِ عام پھانسی دینے کی سزا دی تھی۔پھر میں نے اپنے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور شعیب سے کہا ''تم نے ساری عمر لاہور میں گزار دی ہے اور بیسیوں بار اس علاقے میں آ چکے ہو جہاں بادشاہی مسجد اور ہیرا منڈی کی دیواریں سرگوشیاں کرتی ہیں۔تم نے ان دیواروں کے راز سنے ہوں گے۔مجھے کوئی دلچسپ کہانی سناؤ۔

''کیا آپ نے فقیر بدھن سائیں کی کہانی سنی ہے؟''

''نہیں''

''بہت دلچسپ ہے''۔

''تو پھر سناؤ''۔

''فقیر بدھن سائیں ایک پراسرار شخصیت تھے۔ان کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔وہ ہیرا منڈی کے بالا خانے میں ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔سب لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک ولی اللہ تھے۔طوائفیں اور پولیس افسر سب ان کا احترام کرتے تھے۔وہ بہت

کم بولتے تھےلیکن جب بولتے تھےتو سب سنتے تھے۔سب لوگ ان کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔اگر وہ چند دن اپنے حجرے سے نہ نکلتے تو لوگ پریشان ہو جاتے۔بہت سے لوگ ان سے دعائیں کرواتے تھے۔ایک دفعہ ایک دکاندار نے انہیں گالیاں دیں تو اگلے دن وہ گرا اور مر گیا۔لوگوں کا خیال تھا اسے بدھن سائیں کی بد دعا لگی ہے۔

دلچسپی کی بات یہ تھی کہ مداحوں کو یہ پتہ نہ تھا کہ بدھن سائیں کہاں پیدا ہوئے تھے اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔پھر1950 کی دہائی میں وہ لوگوں کی توجہ کا اس وقت مرکز بنے جب ایک نوجوان عورت سردار بیگم نے مقامی عدالت میں آ کر دعویٰ کیا کہ وہ بدھن سائیں کی بیٹی ہے اور بدھن سائیں نے1920 کی دہائی میں اس کی والدہ اقبال بیگم سے شادی کی تھی۔وہ بدھن سائیں کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔لوگوں کو اس وقت پتہ چلا کہ بدھن سائیں کا تعلق اگرچہ ایک امیر ہندو خاندان سے تھا لیکن نوجوانی میں وہ صوفی کلام سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔بدھن سائیں کے مسلمان ہونے پر ان کا ہندو خاندان بہت ناراض ہوا تھا اور جب انہوں نے ایک مسلمان عورت سے شادی کی تو ان کے خاندان نے انہیں عاق کر دیا تھا۔چنانچہ جب1947 میں بدھن سائیں کا خاندان ہندوستان گیا تو انہیں پیچھے چھوڑ گیا۔

جس دوران سردار بیگم بدھن سائیں کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتی تھی ہیرا منڈی کی ایک اور عورت حفیظہ بیگم نے عدالت میں جج کے سامنے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا کہ ایک زمانے میں اس نے بدھن سائیں سے شادی کی تھی اور ان سے اس کا ایک بیٹا احمد شجاع بھی ہے۔یہ کہنا تھا کہ عدالت میں حفیظہ بیگم اور سردار بیگم میں ٹھن گئی۔دونوں نے ایک دوسرے کو جھوٹا اور مکار ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن جج نے دونوں کے بیانات ماننے سے انکار کر دیا۔

سردار بیگم نے جج کو متاثر کرنے کے لئے یہ بھی ثابت کیا کہ بدھن سائیں1920 کی دہائی میں عدالت میں آئے تھے لیکن ہتکِ عدالت کی وجہ سے جیل میں بھیج دئے گئے تھے۔بدھن

سائیں نے ایک انکم ٹیکس افسر کی ہتک کی تھی۔ پھر جب وہ عدالت میں پیش ہوئے تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔اس وقت اقبال بیگم نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ جج نے کہا کہ عدالت میں برقعہ اتار دیں لیکن بدھن سائیں نے کہا کہ وہ بہت مذہبی ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کی بیگم نامحرم لوگوں کے سامنے برقعہ اتارے۔ جب جج نے اصرار کیا تو بدھن سائین نے جا کر جج کے چہرے پر طمانچہ مار دیا۔ جج نے انہیں عدالت کی ہتک کرنے کی وجہ سے تین سال کے جیل لئے بھیج دیا۔جیل میں تین سال کی قید نے ان کی زندگی بدل دی۔ جب وہ باہر آئے تو انہوں نے خود صوفیانہ شاعری کرنی شروع کر دی۔ وہ عرفان میں اتنا غرق ہوئے کہ اپنا نام بھی بھول گئے۔ان کے ماضی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے لوگوں نے ان کا نام سائیں رکھ دیا اور وہ ہیرا منڈی میں رہنے لگے۔سردار بیگم نے بہت کوشش کی کہ جج اس کی بات مان جائے لیکن وہ جج کو متاثر نہ کر سکی۔اس نے جج کو بادشاہی مسجد کا وہ رجسٹر بھی دکھایا جس میں بدھن سائیں کے اسلام قبول کرنے کا ذکر تھا۔ جج نے دونوں عورتوں کی کہانی سنی لیکن وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا‘‘۔

’’یہ تو بہت ہی دلچسپ کہانی ہے‘‘۔

’’سہیل بھائی! آپ کینیڈا میں پچھلے بیس سال سے ماہرِ نفسیات کے طور پر کام کر رہے ہیں۔آپ کی پیشہ ورانہ زندگی میں سب سے غیر معمولی واقعہ کون سا پیش آیا؟‘‘

’’واقعات تو بہت سے غیر معمولی تھے لیکن اس وقت جو ذہن میں آ رہا ہے وہ اس شخص کے حوالے سے ہے جس کا نام روک تھیریالٹ Rock Theriault تھا اور شہر لنزی کی ایک کمیون میں رہتا تھا۔ مجھے اس شخص کا اس وقت پتہ چلا جب میری ایک مریضہ کی ماں نے مجھے آ کر بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں پریشان ہے کیونکہ وہ ایک شیطانی انسان سے راہ و رسم بڑھا رہی ہے۔ جب میں نے اس مرد کے بارے میں مزید معلومات کیں تو مجھے پتہ چلا کہ وہ فرنچ کینیڈین ہے جو کیوبک سے آ کر لنزی میں بس گیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ولی اللہ ہے لیکن لوگ سمجھتے ہیں کہ

وہ شیطان ہے۔اس کی نو بیویاں اور ستائیس بچے ہیں۔وہ اپنے بچوں کو کمیون میں ہی پڑھاتا تھا چنانچہ حکومت کی چلڈرن ایڈز سوسائٹی Children Aid's Society کے نمائندے اس کے کمیون میں پہنچ گئے اور اسے اور اس کی بیویوں سے کہا کہ یا تو وہ اپنے بچوں کو حکومت کے سکولوں میں بھیجیں اور یا وہ ان بچوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔روک تھیریو اور بچوں کی ماؤں نے حکومت کے نمائندوں سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت نے ان سے وہ بچے لے کر فوسٹر ہومز foster homes میں ڈال دیے۔حکومت کے نمائندوں کو اندازہ نہ تھا کہ ایسا قدم اٹھانے کے کیا مسائل ہونگے۔تھیریو عدالت میں گیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ وہ ان بچوں کا باپ ہے اور اسے ان بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا قانونی حق ہے۔جج نے اس حق کا اعتراف کیا اور اسے ان فوسٹر ہومز میں جانے کی اجازت دے دی۔اب جبکہ روک تھیریو شہر میں آنے جانے لگا وہ فوسٹر ہومز کی ماؤں اور شہر کی دیگر عورتوں سے تعلقات بڑھانے لگا۔ان ہی عورتوں میں سے ایک میری مریضہ تھی جس کی ماں نے آ کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔جب میں نے اپنی مریضہ سے پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ روک تھیریو مجھ سے بہت محبت سے پیش آتا ہے اور میرے لئے تحفے لاتا ہے۔میری مریضہ کی نگاہ میں وہ اس کے عشق میں' جبکہ اس کی ماں کا خیال تھا کہ وہ اس کے جال میں گرفتار ہو رہی ہے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کی روک تھیریو نے اپنے کمیون میں کچھ ایسے جرائم کئے ہیں جن کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلا ہے۔اس مقدمے میں وہ مجرم ثابت ہوا اور جج نے اسے کنگسٹن کی جیل میں بھیج دیا۔وہ آج بھی اس جیل میں ہے اور کچھ سال اور بھی رہے گا۔دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کی چند بیویاں اتنی وفادار ہیں کہ انہوں نے کنگسٹن جیل کے قریب ایک بیکری کھول رکھی ہے اور وہ اس دن کا انتظار کر رہی ہیں جب روک تھیریو جیل سے رہا ہوگا اور وہ ایک دفعہ پھر کسی کمیون کی داغ بیل ڈالیں گی۔

پچھلے دنوں دو جرنلسٹ پول کیلا Paul Kailla اور روس لیور Ross Laver نے روک تھیریو کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام سیویج مسیحا Savage Messiah ہے"

چونکہ کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے میں اور شعیب گھر کی طرف چل دیے۔ہم نے جاتے ہوئے بہت سے بے گھر بچے دیکھے جو اپنے اپنے گاؤں سے نوکری کی تلاش میں لاہور شہر آ نکلے تھے۔میں نے ان بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچا تو میرے سراپا میں کپکپی پھیل گئی۔

==========

پندرواں باب۔۔ ماہرین کی آرا

فورنزک ماہرین کی رائے Forensic Opinion:

جاوید اقبال مغل کی کہانی کا ایک پر اسرار پہلو وہ تیزاب کے ڈبے تھے جو اس کے گھر سے نکلے تھے۔ الزام کے مطابق ان میں سو بچوں کی لاشوں کو تحلیل کیا گیا تھا۔ جاوید اقبال کے بھائی پرویز اقبال کا خیال تھا کہ اس چھوٹے سے گھر میں ایسا کرنا ناممکن تھا۔ اس الزام کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میں فورنزک کے ماہرین کی رائے پڑھنا چاہتا تھا جو مجھے خضر حیات کی کتاب ''سو بچوں کا قتل'' میں مل گئی جو مندرجہ ذیل ہے۔ ''سانحہ راوی روڈ کی تفتیش سائنسی انداز میں نہ ہونے اور پولیس کی غفلت کی وجہ سے شہادتیں غائب ہوگئی ہیں۔ فورنزک سائنس کے ماہر اور لیبارٹری کے انچارج ڈاکٹر عامر علی حسین کے بیان کے مطابق ایک نوجوان مرد کو جلانے کے لئے 30 گیلن اور پندرہ سال سے کم عمر کے بچے کو جلانے کے لئے کم از کم 20 گیلن تیزاب درکار ہوتا ہے جس سے ایک لاش کو تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اوسط 20 گیلن لگائی جائے تو سو جانوں کے لئے دو ہزار گیلن تیزاب درکار ہوتا ہے جس کی قیمت تقریباً 6 لاکھ روپے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتنی بڑی مقدار میں تیزاب صرف فیکٹریوں کو جاتا ہے جس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

انہوں نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ تیزاب میں چیزیں ڈالنے سے جو بخارات پیدا ہوتے ہیں وہ باہر کے لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ اگر پانی میں یا گٹر میں تیزاب پھینکا گیا ہوتا تو گٹروں سے دھواں یا بخارات نکلتے جس سے آس پاس کے لوگوں کو پتہ چل جاتا اور ان علاقوں میں اتنی مقدار میں مسلسل تیزاب پھینکنے سے آگ لگ سکتی تھی اور ماحول پر بھی اثر پڑتا جس کی شہادت ابھی تک نہیں مل سکی۔

REHABILITATION CONSULTANT کی رائے:

کنیڈا آنے کے بعد میں نے ڈاکٹر طاہر قاضی سے رجوع کیا۔ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کی نگاہ میں جاوید اقبال کے ہسپتال میں ۲۲ دن بے ہوش رہنے سے اس کے دماغ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ میں نے انہیں مندرجہ ذیل خط لکھا:

محترمی ڈاکٹر قاضی! جاوید اقبال اور اسکے بڑے بھائی کے انٹرویو سے مجھے پتہ چلا کہ جاوید اقبال کو اسکے ملازموں نے سوتے ہوئے اتنا مارا پیٹا کہ اگلی صبح اس کے ہمساؤں نے اسے خون میں لت پت پایا۔ وہ اسے ہسپتال لے گئے جہاں وہ 22 دن بے ہوش رہا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا اور اگر زندہ رہا بھی تو دماغی طور پر مفلوج ہو جائے گا۔

انٹرویو کے دوران اس نے میری انگلی پکڑ کر اپنے سر اور چہرے کو چھوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔

میں نے جب اس کی ڈائری کے صفحات پڑھے تو مجھے احساس ہوا کہ ان میں سچ اور جھوٹ خلط ملط ہو چکے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپکے خیال میں 22 دن کی بے ہوشی اور coma نے کہیں اسے Traumatic Brain Injury کا مریض تو نہیں بنا دیا ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ جج نے جاوید اقبال کے مقدمے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسے طبی اور نفسیاتی ماہرین کے معائنے تشخیص اور علاج Neuro-psychiatric Evaluation and treatment کے لئے ہسپتال نہیں بھیجا۔

مخلص خالد سہیل

ڈاکٹر طاہر قاضی کا جواب

محترمی ڈاکٹر خالد سہیل۔ مجھ سے میری رائے مانگنے کا شکریہ۔ آپ نے اپنے خط میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی روشنی میں ظاہر ہوتا ہے کہ جاوید اقبال کو طویل عرصہ

تک ہسپتال میں بے ہوش رہنے سے شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اگر اس کے سر اور چہرے کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں اور وہ 22 دن تک coma میں رہا ہے تو وہ Severe Traumatic Brain Injury (TBI) کا مریض ہے۔ اس مرض میں انسان کی دماغی اور جسمانی صحت میں بہت سی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ ویسے تو جاوید اقبال کا معائنہ کئے بغیر میں کوئی بات یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن آپ کے مشاہدات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ دماغی طور پر صحتمند نہیں ہے۔

ماہرین کی رائے کے مطابق TBI کے مریض

... چیزوں پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتے

... ان کی سوچ منفی ہو جاتی ہے

... ان کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے

... وہ اپنے مسائل کا منطقی حل تلاش نہیں کر سکتے

... ان کی شخصیت میں شکست و ریخت ہونے لگتی ہے

بعض ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض میں تشدد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کی اپنی زندگی اور ان کے عزیزوں کی زندگی پر بھی منفی اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔

اس حوالے سے میں آپ سے متفق ہوں کہ جاوید اقبال کا تفصیلی طبی معائنہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے سر کا CTScan بھی ہونا چاہیئے تھا اور Neuro-psychiatric Evaluation بھی۔ آخر میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری نگاہ میں جاوید اقبال کے ۲۲ دن ہسپتال میں بے ہوش رہنے کی وجہ سے وہ Traumatic Brain Injury کا مریض بن دچکا ہے جس نے اسے دماغی طور پر بیمار کر دیا ہے۔ میری رائے میں اس کا مزید معائنہ، تشخیص اور علاج بہت ضروری ہیں۔

مخلص ڈاکٹر طاہر قاضی

Clinical Associate Professor

University of Saskatoon, Saskatchewan, Canada

==========

PSYCHIATRIC OPINION

اپنی تحقیقات کے اختتام پر میں نے ایک چالیس صفحے کی تفصیلی رپورٹ تیار کی اور اس کی ایک کاپی جاوید اقبال کے وکیل نجیب فیصل چوہدری کو بھیجی جس میں اپنی رائے اور مشورے پیش کیے۔ اس رپورٹ کی چند جھلکیاں حاضرِ خدمت ہیں۔

تضاد کی ابتدا:

جاوید اقبال کو' جو ایک محبت بھرے خاندان میں پلا بڑھا اور سکول میں کافی ہر دلعزیز تھا' سب سے پہلے تضاد کا اس وقت سامنا کرنا پڑا جب اس کی ملاقات ماسٹر ریاض سے ہوئی۔ ماسٹر ریاض ایک جابر استاد تھا جو جاوید اقبال پر مظالم ڈھاتا تھا۔ ماسٹر ریاض جاوید اقبال کے بڑے بھائی کا بھی استاد رہ چکا تھا اور اسے بھی ناپسند کرتا تھا۔ جاوید اقبال کو بعد میں احساس ہوا کہ ماسٹر ریاض باقی طالبعلموں پر بھی سختیاں کرتا ہے۔ ایک دن ماسٹر ریاض کے ایک طالبعلم نے غصے میں آ کر اسکے دروازے پر مٹی کا تیل چھڑکا اور اسے آگ لگا دی۔ اس وقت ماسٹر ریاض اپنے طالبعلموں کو پڑھا رہا تھا جن میں جاوید اقبال بھی شامل تھا۔ اس دن سب نے بھاگ کر جان بچائی لیکن ماسٹر ریاض نے جاوید اقبال پر الزام لگایا کہ اس نے دوسرے لڑکے کو آگ لگانے پر اکسایا تھا۔ جاوید اقبال کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس پر غلط الزام تراشی کی گئی ہے اور یہ احساس ساری عمر اس کے ساتھ رہا۔

اوائلِ عمر میں خود مختاری:

جاوید اقبال کے بڑے بھائی پرویز اقبال نے بتایا کہ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے بچے نوجوانی میں ہی علیحدہ ہو جائیں اور اپنا گھر بسا لیں چنانچہ انہوں نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی اوائلِ عمر میں ہی شادی کر دی اور وہ والدین کے گھر سے چلے گئے۔ پرویز اقبال نے شاد باغ میں نیا کاروبار شروع کر دیا۔ پرویز اقبال کا خیال ہے کہ گھر میں بڑے بھائیوں کے نہ رہنے سے جاوید اقبال کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ دو سال بعد جب پرویز اقبال اور جاوید اقبال میں تضاد پیدا ہوا تو انکے والد نے مشورہ دیا کہ پرویز اقبال اپنا کاروبار جاوید اقبال کے حوالے کر دے اور خود برانڈرتھ روڈ کے کاروبار کو سنبھال لے۔ اس طرح جاوید اقبال سترہ سال کی عمر میں ایک خود مختار کاروبار کا مالک بن گیا جبکہ وہ ابھی کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

کالج کی تعلیم کے دوران جاوید اقبال نے سیاسی کاروائیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور حکومت کے خلاف ایک جلوس میں اسے پولیس نے اتنا مارا کہ اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کالج کو خیر باد کہا اور فل ٹائم بزنس کرنے لگا۔

جاوید اقبال شروع سے لیڈر بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک سماجی کارکن بن گیا اور غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرنے لگا۔ وہ معاشرے میں ظلم اور استحصال کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ شاد باغ ایسوسی ایشن میں شامل ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں معاشرے کا ایک باعزت فرد بن گیا۔ سب لوگ اس کا احترام کرنے لگے لیکن یہ عزت و آبرو کی زندگی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔

ناکام شادی:

جاوید اقبال کی ناکام شادی اس کی جوانی کا پہلا المیہ تھی۔ ایک طرف اس کے والدین

کی خواہش تھی کہ اس کی شادی ہو جائے اور دوسری طرف جب اس نے اپنے لئے دلہن تلاش کر لی تو انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ جاوید اقبال مغل خاندان میں ہی شادی کرے۔ جاوید اقبال اور اس کے خاندان کا تضاد اس قدر بڑھا کہ جاوید اقبال نے خودکشی کی دھمکی دی۔ آخر جاوید اقبال کے ایک چچا نے رشتہ داروں کو راضی کر لیا اور جاوید اقبال نے اپنی مرضی سے شادی کر لی جو نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔

ایک ماہرِ نفسیات کے حوالے سے میں سوچتا ہوں کہ جاوید اقبال کی خودکشی کی دھمکی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس نے مسائل کا صحتمندانہ حل تلاش کرنا نہ سیکھا تھا۔ بعض رشتہ داروں کا خیال تھا کہ جاوید اقبال کے والدین کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا اور وہ ہر بات پر من مانی کرنا چاہتا تھا۔ جاوید اقبال کی شادی جو بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھی زیادہ دیر نہ چل سکی اور اس کی حاملہ بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ اسے کیوں چھوڑ کر گئی؟ وہ اتنی ناخوش کیوں تھی؟ اس میں اور جاوید اقبال میں بنیادی تضاد کیا تھا؟ میں نے جب یہ سوال اٹھائے تو مختلف لوگوں نے مختلف جواب دئے۔ جاوید اقبال کے بڑے بھائی پرویز اقبال کا خیال ہے کہ جاوید اقبال کی بیگم (جس کا خاندان سعودی عرب میں تھا اور وہ چھوٹے بہن بھائیوں کی سرپرست تھی) نے جاوید اقبال سے کہا کہ وہ اپنے سسرال میں رہے جسے جاوید اقبال نے اپنی ہتک سمجھی کیونکہ وہ گھر جوائی نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس تضاد کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑیں پڑ گئیں۔

جاوید اقبال کی بیوی نے پولیس کو یہ بتایا کہ وہ جاوید اقبال کو اسلئے چھوڑ کر چلی گئی تھی کیونکہ اس کے نابالغ لڑکوں سے جنسی تعلقات تھے۔

جاوید اقبال کے رفیقِ کار نے کہا کہ جاوید اقبال اپنی بیوی سے عقبی مباشرت کرتا تھا اس لئے وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

جاوید اقبال اپنی جنسی زندگی کی وجہ سے اپنے رشتہ داروں' ہمسایوں اور رفقاء کار سے تضادات کا شکار تھا۔ وہ سب اسے ایک بدکار انسان سمجھتے تھے۔ جاوید اقبال کے لئے اس کے عزیزوں کی نگاہوں میں غصہ اور نفرت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ہم جنسی تعلقات:

جاوید اقبال کے نوجوانی سے ہی نابالغ لڑکوں سے جنسی تعلقات تھے۔ اس طرزِ زندگی نے اسے بدنام کر دیا تھا۔ اسکے بھائی بھی اپنے بیٹوں کو اس سے دور رکھتے تھے۔ جب وہ ہم جنسی تعلقات میں پکڑا گیا تو اس کے ہمسایوں نے اسے جوتیاں مار کر سارے محلے میں گھمایا اور اسے سب سے معافی مانگنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اسے شہر بدر کر دیا۔

وہی شخص جو اپنی کمیونٹی کا ایک معزز سماجی کارکن تھا چند ہی مہینوں میں ایک بدنامِ زمانہ شخص بن گیا۔ ایک ولی ایک پاپی بن گیا اور اسکے اپنے اور پرائے سب اسکے خلاف ہو گئے۔

یہ بھی ایک دلچسپی کی بات ہے کہ جاوید اقبال نے لوگوں کو پیسوں کا لالچ دے کر ان کے منہ بند کروا دئے تھے۔ اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ دولت خرچ کر کے وہ اپنے اعمال کے نتائج سے بچ سکتا ہے۔

ہم جنس پسندی پر پاکستان میں بہت سی پابندیاں ہیں کیونکہ ایسے طرزِ زندگی کو غیر قانونی' غیر اخلاقی اور غیر فطری سمجھا جاتا ہے۔ اس معاشرے پر اس موضوع پر تبادلہِ خیال نہیں ہوتا۔ بچوں کو نہ ان کے اساتذہ اور نہ ہی والدین جنسی تعلیم دیتے ہیں اسی لئے بہت سے لوگ زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص ہم جنس پسندی کی زندگی گزار رہا ہے تو وہ لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔ پاکستان میں دو عاقل و بالغ مردوں اور ایک بالغ مرد اور ایک نابالغ لڑکے کے درمیان جنسی رشتے میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ مغرب میں تو عاقل و بالغ لوگوں کے درمیان ہم جنسی تعلقات کو ایک ذاتی عمل سمجھا جاتا ہے

لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔

عالمی انسانی حقوق گائیڈ World Human Rights Guide کے مطابق پاکستان دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جہاں ہم جنس پسندوں کو سب سے زیادہ صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پیشتر سرگودھا کے ایک جج نے ایک مرد کو ہم جنسی تعلقات کی وجہ سے سات سال کی قید اور ساٹھ ہزار روپے کا جرمانہ کیا۔ اگر وہ شخص جرمانہ ادا نہیں کرے گا تو اسے مزید پانچ سال جیل میں گزارنے پڑیں گے۔

ایسے ماحول میں ہم جنسی کے موضوع پر مکالمے کی فضا نہیں ہے اس لئے عوام اس موضوع کے بارے میں بہت سے غلط تصورات رکھتے ہیں۔ ان کا اس موضوع کے بارے میں نقطۂ نظر سائنسی نہیں ہے۔ وہ اس طرزِ زندگی کے بارے میں نفسیاتی بصیرتوں سے محروم ہیں اور سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جن مردوں کو عورتوں کی قربت نصیب نہیں ہوتی وہ لڑکوں سے جنسی تعلقات قائم کر کے اپنی جنسی بھوک مٹاتے ہیں۔

جاوید اقبال کے خاندان نے بھی جاوید اقبال کی شادی کے ٹوٹ جانے کو اس کی ہم جنس پسندی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ پرویز اقبال نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ چونکہ جاوید اقبال کی کچھ جسمانی ضروریات تھیں جو شادی کے ٹوٹ جانے سے پوری نہ ہو رہی تھیں اس لئے اس نے لڑکوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر لئے تھے جن کی وجہ سے اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جاوید اقبال کے خاندان نے یہ کبھی قبول نہیں کیا کہ جاوید اقبال ایک ہم جنس پسند انسان تھا اور وہ عورتوں پر مردوں کو ترجیح دیتا تھا۔

جب جاوید اقبال کو اس کے ہمسایوں اور رفقاءِ کار نے شہر بدر کر دیا تو اس نے نیا کاروبار شروع کر دیا۔ پہلے اس نے ایک بچوں کے لئے ایئر کنڈیشنڈ سکول بنایا' جو اس علاقے کا پہلا ایئر کنڈیشنڈ سکول تھا۔ پھر اس نے بچوں کے لئے وڈیو سنٹر بنائے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو اس

کے لڑکوں کے ساتھ جنسی تعلقات کا اندازہ ہو گیا اور وہ اس سے کترانے لگے۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں اپنے علاقے کا بدنام ترین انسان بن گیا۔

جاوید اقبال کی ہم جنسی طرزِ زندگی قائم رہی حتیٰ کہ اس پر 1990 میں مقدمہ چلا۔ اس وقت اس کے خاندان پر آزمائش کا دور گزرا کیونکہ جاوید اقبال حادثے کے بعد شہر چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا اور اس کے خاندان کو پولیس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے والد کیلئے وہ واقعہ باعثِ ندامت تھا۔ ان کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔ وہ اتنے شرمندہ ہوئے کہ اسکے بعد ساری عمر سر اٹھا کر نہ چل سکے۔

دوسری شادی:

جب جاوید اقبال جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس کے رشتہ داروں نے اس کی شادی کے مسائل کو حل کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ اس کی بیوی نے اس کے گھر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے سب کو بتا دیا کہ وہ جاوید اقبال سے نفرت کرتی ہے۔ آخر جاوید اقبال کی بیوی اور سسر نے جاوید اقبال کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی اگرچہ اس شادی سے جاوید اقبال کی ایک بیٹی بھی تھی۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اسے ایک مطلقہ عورت کے طور پر جانیں۔

چونکہ جاوید اقبال کے خاندان نے کبھی اس کی ہم جنس پسندی کو قبول نہ کیا اس لئے انہوں نے اسے دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے ان کی بات تو مان لی لیکن دوسری شادی بھی پہلی شادی کی طرح ایک سانحہ ثابت ہوئی۔ اس کی دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کی طرح، اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی گود میں بھی جاوید اقبال کا ایک بچہ تھا۔ فرق اتنا تھا کہ جب اسے احساس ہو گیا کہ ان کے راستے جدا ہیں تو اس نے طلاق لے لی۔ دونوں بیویوں نے اپنے بچوں کی اکیلے ہی نگہداشت کی۔ جاوید اقبال نے کبھی اپنے بچوں کے ساتھ وقت نہیں گزارا اور نہ

ہی ان کی ذمہ داری قبول کی۔ سالہا سال بیت گئے اور اس نے ان کا حال تک نہ پوچھا۔ ستم ظریفی یہ کہ ساری دنیا کے بچوں کے بارے میں سوچنے والا اپنے بچوں سے غافل رہا۔

یہ بات واضح ہے کہ جاوید اقبال کے خاندان کو اسکے جنسی مسائل کی نوعیت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ اسی لئے وہ جتنا انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے وہ اتنے ہی گنجلک ہوتے جاتے۔ جاوید اقبال نے خود مجھے بتایا کہ اس کے بچپن میں باباجی نے اس کے والد کو مشورہ دیا تھا کہ جاوید اقبال کی شادی نہ کروانا لیکن انہوں نے باباجی کے اس مشورے پر عمل نہ کیا۔

والد کی وفات:

جاوید اقبال کے والد اپنے بیٹے کے مسائل سے بہت دکھی ہوئے۔ جب جاوید اقبال کی دوسری شادی بھی ناکام رہی تو ان کا دل ٹوٹ گیا۔ انہیں احساس ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے کے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ وہ اتنے مایوس ہوئے کہ 17 جولائی 1993 کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ والد کی وفات سے نہ صرف جاوید اقبال کا ایک اہم سہارا ختم ہو گیا بلکہ باقی رشتہ دار بھی اس سے دور دور رہنے لگے۔ اس کے بھائیوں نے اسے جائداد کا حصہ تو دے دیا لیکن جذباتی طور پر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔

پولیس سے رابطہ:

ایک دفعہ جب جاوید اقبال کے گھر والے اس سے ملنے گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ اس کے گھر کے باہر بہت سی پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پہلے تو وہ سمجھے کہ پولیس جاوید اقبال کو پکڑنے آئی ہے لیکن پھر یہ جان کر اور بھی حیران ہوئے کہ وہ سب افسر اس کے دوست تھے۔ جاوید اقبال کے خاندان کو اسکا پولیس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہ تھا۔ اس کی پولیس سے راہ و رسم اتنی بڑھی کہ اس نے پولیس کے بارے میں ایک رسالہ بھی نکالا جس میں وہ اپنے پسندیدہ

افسروں کی تصویریں چھاپتا تھا۔

جاوید اقبال کی ایک طرف پولیس افسروں سے اور دوسری طرف قانون شکن مجرموں سے دوستی بڑھتی گئی۔اس نے ان دونوں انتہاؤں میں توازن قائم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

ہم جنسی کا مقدمہ:

جاوید اقبال پر ہم جنسی کا دوسرا مقدمہ 1998 میں چلا۔اس کے بھائی کا خیال ہے کہ جاوید اقبال کے دوستوں نے' جو اس کا قرض نہ اتارنے کی وجہ سے اسکے دشمن ہو گئے تھے' اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔

یوں لگتا ہے جیسے جاوید اقبال کے دوست' ہمسائے اور رشتہ دار آہستہ آہستہ اس سے یا تو کنارہ کش ہو گئے اور یا اسکے دشمن بن گئے۔

آخری سانحہ:

1998 میں حالات اتنے بگڑے کہ جاوید اقبال کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال میں 22 دن گزارنے پڑے۔ایک صبح جاوید اقبال کے ہمسایوں کو چیخوں کی آوازیں آئیں۔جب وہ بھاگ کر گھر گھسے تو انہوں نے جاوید اقبال اور بارہ سالہ ارباب کو بے ہوش پایا۔دونوں کو دو مختلف ہسپتالوں میں لے جایا گیا۔ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ جاوید اقبال کو اتنی شدت سے مارا پیٹا گیا ہے کہ وہ مر جائے گا۔آخر ایک معجزہ ہوا اور وہ زندہ بچ گیا لیکن اس حادثے میں اس کے سر' چہرے اور جبڑے کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔وہ ابھی پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہوا تھا کہ اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔اس کے گھر والے اسے ایک اور ہسپتال لے گئے لیکن وہاں ان سے ''جانوروں کا سا سلوک'' کیا گیا۔جاوید اقبال ہسپتال کے عملے کے رویے سے بہت مایوس ہوا۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا کہ جن لڑکوں نے اسے مارا پیٹا گیا تھا ان پر نہ صرف مقدمہ نہ چلایا گیا

تھا بلکہ ایک پولیس افسر نے اس لڑکے کو اپنے گھر ملازم رکھ لیا تھا۔

آہستہ آہستہ پولیس کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات بدلا لینے کے جذبے میں بدلنے لگے۔ جاوید اقبال اپنے خاندان سے بھی مایوس تھا کیونکہ انہوں نے اس کا مکمل علاج نہ کروایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر نے ابتدائی آپریشن کا خرچ 95,000 روپے بتایا تھا جو ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ جاوید اقبال کی امیدوں پر آہستہ آہستہ اوس پڑنے لگی۔ اس کی آخری امید اس کی والدہ تھی جنہوں نے ہر حال میں اس کا خیال رکھا تھا۔ جب وہ 22 دن بیہوش رہا تھا تو اس کی والدہ نے اس کی نگہداشت کی تھی۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ جب اسے 22 دنوں کی بیہوشی کے بعد ہوش آیا تھا تو اس کا سر اپنی والدہ کی گود میں تھا اور انہوں نے اسے ہسپتال کے قیام کی تفاصیل بتائی تھیں۔

اگلے برس جب جاوید اقبال کی والدہ بہت بیمار ہو گئیں تو انہیں ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ والدہ کی بیماری کے بارے میں اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا

''9 جولائی 1999:

''امی کو ڈاکٹروں نے مشینیں لگا کر بمشکل زندہ رکھا ہے۔ میں روز رکشہ میں آتا ہوں اور صبح سے رات تک ہسپتال میں رہتا ہوں۔ وہاں سب بھائی' بہنیں اور بھابیاں وقت دیتی ہیں۔ سب امی کو بچانے کیلئے کوششیں کر رہے ہیں۔ 5 جولائی سے اب تک روزانہ وہاں جاتا ہوں۔ رات تک ہسپتال کے باہر رہتا ہوں۔ میں نے اشارے سے اقبال کو' جس کو میں نے بچپن سے پالا ہے بتایا ہے کہ اب میری زندگی کے آخری دن ہیں''۔

26 جولائی 1999:

''آج امی فوت ہو گئیں۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ گئی۔ میرے قاتلوں کی وجہ سے میری بے گناہ ماں بھی مر گئی۔ امی کو صرف میرے غم نے مار ڈالا۔ میرے قاتل میری ماں کو بھی قتل کر چکے

تھے اب میں انشاء اللہ دنیا سے بھرپور بدلہ لوں گا۔ اپنا بھی اپنی ماں کا بھی۔ دنیا کی سینکڑوں ماؤں کو رلا رلا کر ماروں گا۔

میری یہی غلطی تھی جو میں نے لاوارثوں کو سہارا دیا۔ مگر وہ مجھے قتل کر کے بھاگ گئے۔ ایک گرفتار ہوا مگر ایس ایچ او نے اسے اپنا ملازم رکھ لیا۔ میرے ہاتھوں قتل کا جب دنیا کو پتہ چلے گا تو دیکھوں گا کہ اس کو بھی کون بچائے گا۔ پولیس یا لوگ مجھے انصاف کرتے نظر نہیں آتے... میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بھرپور بدلہ لے سکتا ہوں"۔

والدہ کی بیماری نے اسکے غصے' نفرت' تلخی اور بدلا لینے کے جذبات کی آگ پر مٹی کے تیل کا کام کیا۔ جب اس کی والدہ فوت ہوگئیں تو چنگاریوں نے شعلوں کا روپ دھار لیا اور اس نے ساری دنیا کو تباہ کرنے کی ٹھان لی۔"

ٹوٹا ہوا آدمی:

والدہ کی وفات کے بعد جاوید اقبال ٹوٹ کر بکھر گیا۔ وہ جسمانی طور پر معذور اور ذہنی طور پر اپاہج ہوگیا۔ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا۔ صحت' دولت' عزت اور زندگی پر ایمان۔ آخر وہ اتنا غمزدہ ہوا کہ اس نے خودکشی کی ٹھانی اور دریائے راوی میں چھلانگ لگانے چلا گیا لیکن پھر اس کے غصے نے نفرت' تلخی اور بدلہ لینے کے جذبے کا روپ دھارا اور وہ لوٹ آیا۔ آخر اس نے گھر سے بھاگے ہوئے ایک سو لڑکوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

جاوید اقبال نے اپنی ڈائری میں ان سو لڑکوں کی تفاصیل لکھیں۔ اس نے لکھا ہے کہ اس نے پہلے تیزاب کے ڈبے جمع کیے۔ پھر چند نوجوانوں کو راضی کیا کہ وہ اس منصوبے میں اس کی مدد کریں۔ پھر وہ داتا دربار اور یادگارِ پاکستان سے لاوارث لڑکوں کو لاتے رہے اور ان کو قتل کر کے تیزاب کے ڈبوں میں تحلیل کرتے رہے۔

ڈائری کے مطابق جب سو لڑکوں کے قتل کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تو اس نے اپنی

ڈائری اور 57 لڑکوں کی تصویریں پولیس انسپکٹر کو بھیج دیں۔اس نے پولیس کو بتایا کہ اس کے پاس بندوقیں، زہر کی بوتلیں، تیزاب کے ڈرم اور زنجیریں ہیں لیکن شروع میں پولیس نے اس کی کہانی کو جھوٹا اور اس کو ایک دیوانہ سمجھا۔اس کا سب مذاق اڑاتے رہے۔اس سارے المیے میں پولیس کا کردار نہایت غیر ذمہ دارانہ تھا۔جاوید اقبال نے خود اپنی ڈائری میں اس کی چند جھلکیاں پیش کی ہیں۔وہ لکھتا ہے

''ایک موقعہ آیا کہ زندگی میرے لئے ایک گالی بن گئی۔تب میں نے دعا کی کہ یا خدا مجھے اتنی قوت دے کہ میں ساری دنیا کو تباہ کر دوں۔ایک سے سو تک قتل میرے سامنے کچھ بھی نہیں۔میں نے سو کی قسم کھائی تھی ایک سو ایک کی نہیں۔اس لئے 100 ہی مارے۔جب میں نے 100 بچوں کو قتل کر دیا تب 22 نومبر 1999 کو آئی جی، ڈی آئی جی کو خطوط لکھے مگر سب نے سمجھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔جس کے بعد ڈی ایس پی طارق کمبوہ کمانڈو فورس کے ساتھ میرے گھر آئے اور گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا مگر پولیس والوں کے پھلانگنے سے قبل میں نے دروازہ کھول دیا۔میرا پروگرام تھا کہ میں خود کو شوٹ کر لوں۔میرے ہاتھ میں پوائنٹ ٹوٹو کا پستول تھا۔طارق کمبوہ نے مجھ سے سوالات کئے اور کہا کہ تمہارے لئے ہی آیا ہوں۔طارق کمبوہ کے ساتھ انسپکٹر بھی تھا۔اس نے پہلے مجھے ہینڈز اپ بھی کروایا تھا۔پھر میرا چہرہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔وہ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس لئے وہاں آیا ہے۔میں نے اپنا پوائنٹ ٹوٹو کا پستول کنپٹی پر رکھا کیونکہ میرا مشن پورا ہو چکا تھا۔میں نے بتایا میں جاوید اقبال ہوں آپ میرے پاس ہی آئے ہیں۔طارق کمبوہ نے کہا تمہارے کاغذ ہمیں ملے ہیں۔میرے مکان پر اس وقت لاشیں موجود تھیں۔کچھ دیر کے بعد طارق کمبوہ نے کہا کہ تم سو جاؤ۔سو جاؤ شاباش۔میں سمجھ نہیں سکا کہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے۔پھر میں نے اپنا پستول طارق کمبوہ کو دیا۔مگر اس نے نہیں پکڑا۔بعد میں ایک انسپکٹر نے پستول لے لیا۔میں نے اسے کہا کہ پستول کو ان لوڈ کر لو۔جس کے بعد طارق

کمبوہ نے کہا کہ ہمیں افسوس ہے ہم آئے اور آپ کو تنگ کیا۔ میں حیران ہو کر اس کا منہ دیکھتا رہا۔ پھر طارق کمبوہ نے کہا ''اسی تہاڈی مدد لئی آئے واں''۔ جس کے بعد اس نے میرا ایک بیگ اٹھایا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ پھر اس نے وہاں پر پڑی زنجیریں اٹھائیں اور کہا کہ بڑی خطرناک زنجیریں ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس نے زنجیریں واپس رکھ دیں۔ شاید اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ جس کے بعد اس نے پھر مجھے کہا سو جاؤ۔ آرام کرو اور صبح دفتر آ جانا۔ میں نے پوچھا کہاں تو اس نے کہا کہ سی آئی اے قلعہ گوجر سنگھ۔ جس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا آؤ چلو۔ اگلے دن میں قلعہ گوجر سنگھ پولیس گیا جہاں انہوں نے ساجد کو رکھا ہوا تھا لیکن پولیس والوں نے مجھے اور ساجد دونوں کو پھر چھوڑ دیا۔

2 دسمبر 1999 کو پولیس کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور انہوں نے جاوید اقبال کو تلاش کرنا شروع کیا لیکن اس وقت تک وہ روپوش ہو چکا تھا۔ وہ پولیس سے ایک قدم آگے تھا۔ جو لوگ جاوید اقبال کو اچھی طرح جانتے تھے ان کا خیال تھا کہ پولیس اسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ اگر وہ پکڑا گیا تو وہ خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرے گا۔ پولیس افسر جب جاوید اقبال کو تلاش کر رہے تھے انہوں نے اس کے گھر والوں کو غیر قانونی طور پر حوالات میں بند کر رکھا تھا۔

جاوید اقبال نے بالآخر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ 30 دسمبر 1999 کو ''جنگ'' اخبار کے دفتر پہنچ گیا جہاں اس نے جرنلسٹوں کو انٹرویو دیا جس کے بعد پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔ اگلے دن ''جنگ'' اخبار میں اس کی تصویریں چھپیں اور اسے اپنی صدی کا سب سے بڑا قاتل قرار دیا گیا۔ اس کے بعد وہ جیل میں رہا۔ 16 مارچ 2000 کو جب وہ عدالت میں پیش ہوا تو اس نے اپنے جرائم سے بالکل انکار کر دیا لیکن جج نے اسے سو بچوں کا قاتل قرار دیا اور اسے ایک بھیانک سزا دی۔

مانیں یا نہ مانیں:

جب میں نے جج کا فیصلہ پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے جج نے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر جاوید اقبال کو مجرم قرار دیا تھا۔

1۔جاوید اقبال کی ڈائری جو اس نے پولیس سٹیشن بھیجی تھی۔

2۔جاوید اقبال کے گھر سے برآمد کیئے گئے پوسٹر (خوشخطی کے ماہرین کی رائے تھی کہ ان پوسٹروں پر جاوید اقبال کی لکھائی تھی)۔

3۔لڑکوں کی تصویریں جو جاوید اقبال نے پولیس سٹیشن بھیجی تھیں۔

4۔لڑکوں کے وہ کپڑے اور جوتے جو جاوید اقبال کے گھر سے برآمد ہوئے تھے اور جنہیں لڑکوں کے والدین نے پہچانا تھا۔

5۔جاوید اقبال کے بیانات جو اس نے اخباری نمائندوں کو دئے تھے۔

جب میں نے جاوید اقبال کے بیانات اور ڈائری کے اوراق پڑھے تو مجھے ان میں اتنے تضادات نظر آئے کہ مجھے یوں لگا جیسے حقیقت اور افسانہ شیر وشکر کی طرح اس قدر گھل مل گئے ہوں کہ انہیں جدا کرنا ممکن نہ ہو۔میری نگاہ میں جاوید اقبال نے سچ اور جھوٹ کو خلط ملط کر دیا تھا۔جاوید اقبال کے بھتیجے کا انٹرویو اس کی صرف ایک مثال تھی جس سے واضح تھا کہ اس نے ایک لڑکی کے قتل کا جو واقعہ اپنی ڈائری میں لکھا تھا وہ من گھڑت تھا۔اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مجھے یہ پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ اگر چہ جاوید اقبال ہسپتال میں 22 دن بیہوش رہا تھا پھر بھی جج نے جاوید اقبال کو ماہرینِ نفسیات کے پاس تشخیص کے لئے نہ بھیجا تھا۔مجھے جاوید اقبال کی ڈائریوں پر بالکل بھروسہ نہ تھا۔

جاوید اقبال کی ساری کہانی پڑھ کر اور اسحاق بلا کے قتل میں پولیس کے کردار کو دیکھ کر

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جج نے فیصلہ کرنے میں بہت عجلت کا مظاہرہ کیا۔ مقدمہ فروری 2000 میں شروع ہوا اور مارچ 2000 میں ختم ہوگیا۔ جج نے سو بچوں کے قتل کا فیصلہ سنانے میں سو دن کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اسے خود بھی اس جلدی کا اندازہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے فیصلے میں خود لکھا تھا کہ پولیس کو ایک بھی بچے کی لاش نہیں ملی اور پولیس نے جو جسمانی اعضاء پیش کیے تھے وہ انسانی اعضاء نہ تھے۔ جج نے جلد فیصلہ سنانے کی یہ تاویل پیش کی کہ اسے لاہور کے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج میاں محمد جہانگیر کا حکم تھا کہ اس کیس کا فیصلہ جتنی جلد ہو سکے کر دیا جائے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر جج ساری شہادتوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا اور اس کیس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا تو اس کا فیصلہ بہت مختلف ہوتا۔

تشخیص:

جاوید اقبال اور اس کے رشتہ داروں اور ہمسایوں کے انٹرویو اور اس کی ڈائری کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ جاوید اقبال کی شخصیت میں کجی ہے اور وہ پرسنیلٹی ڈس آرڈر Personality Disorder کا مریض ہے۔ ذہنی بیماریوں کی بین الاقوامی تشخیص کے مطابق پرسنیلٹی ڈس آرڈر کے مریضوں میں مندرجہ ذیل عوارض موجود ہوتے ہیں:

... ان کی سوچ اور فکر اپنے ماحول کی روایات سے ٹکراتی ہے

... ان کے اعمال سے اوروں کو نقصان پہنچتا ہے

... ان کو غصہ بہت جلد آجاتا ہے

... ان کی شخصیت میں لچک نہیں ہوتی

... وہ اپنے تجربات سے کچھ نہیں سیکھتے

... ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے گھر والوں اور معاشرے کو بہت تکلیف ہوتی ہے

... ان کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل نوجوانی میں شروع ہوتے ہیں اور عمر بھر قائم رہتے ہیں۔

جب ہم جاوید اقبال کی شخصیت اور طرزِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان میں مندرجہ ذیل مسائل دکھائی دیتے ہیں

نرگسیت NARCISSISM:

جاوید اقبال ایک انا پرست انسان ہے۔ وہ بچپن سے اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے پاس خاص روحانی اور تخلیقی صلاحتیں ہیں جن کی وجہ سے بابا جی نے اسے ''برگزیدہ انسان' کہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر شروع سے غرور تھا اور جب اس کی انا کو دھچکہ لگتا تھا تو وہ دوسروں کا استحصال کرنے سے نہ کتراتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں اور ہمسایوں کا خیال ہے کہ وہ ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

سائیکو پیتھک کردار Psychopathic Personality Disorder:

جاوید اقبال نے جب بھی غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کئے اسے کبھی بھی احساسِ جرم نہیں ہوا۔ یوں لگتا ہے کہ اس کا ضمیر مر چکا ہے اسی لئے اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا ''ہمارے دل پتھر کے ہو چکے ہیں''۔ وہ ہمیشہ اپنے غلط اعمال کی کوئی نہ کوئی توجیہہ پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ ساری عمر روایات کو توڑتا رہا اور دوسروں کا دل دکھاتا رہا۔ اس نے جب بھی قانون شکنی کی تو اس کے نتائج سے بچنے کے لئے لوگوں کو رشوت دیتا رہا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ وہ کسی ''غلط فہمی'' کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اس نے عدالت میں بھی اقرارِ جرم نہیں کیا۔

پیڈوفیلیا PEDOPHILIA:

جاوید اقبال نہ صرف نابالغ لڑکوں میں دلچسپی لیتا رہا بلکہ ان کا جنسی استحصال بھی کرتا رہا۔ اگرچہ اس نے دو شادیاں کی تھیں لیکن وہ دونوں ناکام رہیں۔ اس کے ادرگرد ہمیشہ لڑکے رہتے تھے۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ لڑکوں کو ورغلانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

وہ اس کے سحر میں ایسا گرفتار ہو جاتے کہ اپنی زندگیاں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ پہلی دفعہ جیل جانے کے بعد بھی جاوید اقبال نے بچوں کے جنسی استحصال کا سلسلہ ختم نہ کیا۔

ڈیپریشن DEPRESSION:

جاوید اقبال ہسپتال کے داخلے کے بعد ڈیپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے کئی دفعہ خودکشی کے بارے میں بھی سوچا تھا اور ایک دفعہ دریائے راوی میں کودنے بھی گیا تھا لیکن پھر لوٹ آیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے ڈیپریشن کے جذبات غصے' نفرت' تلخی اور بدلہ لینے کے جذبے میں ڈھلتے رہے۔

منشیات کا استعمال DRUG ABUSE:

جاوید اقبال زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف اقسام کی ادویات استعمال کرتا رہا۔ پولیس نے جب اس کے گھر کی تلاشی لی تو انہیں مختلف اقسام کی ادویات اور منشیات ملیں۔ جس دن اسے گرفتار کیا گیا اس دن بھی اس نے موزوں میں گولیاں چھپا رکھی تھیں۔ مجھے انٹرویو دینے کے دوران بھی اس نے اقرار کیا تھا کہ اسے ایک دفعہ چند دنوں تک غیر معمولی چیزیں نظر آتی رہیں جو میری نگاہ میں اس کی Visual hallucinations تھیں جو اکثر اوقات منشیات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔

دماغی معذوری Brain Damage:

جاوید اقبال چونکہ ۲۲ دن ہسپتال میں بیہوش رہا تھا اس لئے اس کا دماغ کافی متاثر ہو گیا تھا۔ اس حادثے نے نہ صرف اس کی یادداشت کو متاثر کیا تھا بلکہ اس کی صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بھی مجروح کیا تھا۔ اس کے سر' چہرے اور جبڑے کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ جسمانی اور ذہنی طور پر معذور ہو چکا تھا۔

مشورہ Recommendation:

میں نے جاوید اقبال کے وکیل کو اپنے خط میں مشورہ دیا تھا کہ وہ جج سے درخواست کرے کہ جاوید اقبال کو سولی پر چڑھانے سے پہلے اس کی جسمانی، دماغی اور ذہنی بیماریوں کے معائنے کا حکم دے تا کہ اس کی نہ صرف صحیح تشخیص ہو سکے بلکہ علاج بھی ہو سکے جو اس کا انسانی حق ہے۔میں نے کہا کہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے ہمیں جاوید اقبال کے Neuro-psychiatric Assessment and Treatment کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

===========

سولہواں باب.. کلٹش شخصیت Cultish Personality

جب میں جاوید اقبال کے بارے میں اپنی نفسیاتی رائے تحریر کر رہا تھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک ہے جو اتنی پیچیدہ اور گنجلک ہے کہ اسے نفسیاتی بیماریوں کے روایتی پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس کی شخصیت میں سائیکو پیتھک شخصیت کے عوارض تو ہیں لیکن اور بھی بہت کچھ ہے جو باقی سائیکو پیتھک کرداروں میں نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اپنی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش رکھتے ہیں اور اپنے پیروکاروں' مداحوں اور چاہنے والوں سے ایک کلٹ Cult بنا لیتے ہیں اسی لئے میں نے ان کی شخصیت کو کلٹش شخصیت Cultish Personality کا نام دیا ہے۔

کلٹش شخصیت رکھنے والے لوگ غیر روائتی انداز سے سوچتے ہیں اور تمام روایات اور معاشرتی اصولوں کو توڑتے ہیں۔ وہ قانون شکنی کرتے بالکل نہیں گھبراتے۔ وہ اپنے ماحول کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ اوروں کی نگاہ میں مجرم اور گناہگار سمجھے جاتے ہیں۔

ان کی مقناطیسی شخصیت کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کے مرید بن جاتے ہیں اور ان پر اتنے فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کے مریدوں اور پیروکاروں کا حلقہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے جب وہ قانون کی ضد میں آتے ہیں تو ان کے مرید اور چاہنے والے بھی سزائیں پاتے ہیں کیونکہ اکثر اوقات وہ ان کے جرائم میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے جب جاوید اقبال پکڑا گیا تو اس کے نوجوان ساتھی بھی اس کے ساتھ جیل میں گئے۔ ایک ساتھی اسحاق بلا کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ان نامساعد حالات میں بھی جاوید اقبال کے نوجوان ساتھیوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور آخری دم تک وفاداری کا ثبوت دیتے رہے۔ وہ جاوید اقبال کے سحر سے رہائی نہ پاسکے۔

جب میں بیسویں صدی کی کلٹش شخصیات کے بارے میں سوچتا ہوں تو سب سے پہلے جس شخصیت کا خاکہ میرے ذہن میں ابھرتا ہے وہ گریگری راسپوتین Gregory Rasputin ہے۔ وہ سائبیریا کے صحرا میں پیدا ہوا تھا اور روس کا مشہور اور بدنامِ زمانہ شخص بن کر مرا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک پادری کے طور پر کیا تھا لیکن اس کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ وہ مشہور ہوتا چلا گیا۔ وہ کئی حوالوں سے ایک غیر معمولی انسان تھا۔ جتنے لوگ اس سے محبت کرتے تھے اسی قدر اس سے نفرت بھی کرتے تھے کیونکہ وہ اصولوں اور قوانین کو توڑنے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتا تھا۔ عوام کو جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہپناٹزم کی طاقت رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے پاس روحانی طاقت بھی ہے جس سے وہ مریضوں کا علاج کر سکتا ہے۔

جب روس کے بادشاہ نکولس Nicholas اور ملکہ ایلگزنڈرا Alexandra و پتہ چلا کہ ان کا بیٹا ہیموفیلیا Hemophilia کا مریض ہے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ایک دفعہ بیماری کی وجہ سے اس کا ایسا خون بہنا شروع ہوا تو وہ بند ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ نے دربار کے سب نامی گرامی ڈاکٹروں اور حکیموں کو بلایا لیکن وہ بچے کا علاج نہ کر سکے۔ سب کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ بچہ مر جائے گا۔ آخر ملکہ کی ایک ملازمہ نے مشورہ دیا کہ راسپوتین کو بلایا جائے۔ جب راسپوتین آیا تو اس نے سب سے پہلے ان ڈاکٹروں اور حکیموں کو کمرے سے نکل جانے کو کہا پھر وہ بچے کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

آدھ گھنٹہ بعد جب سب کمرے میں آئے تو انہیں یقین نہ آیا کہ شہزادہ نہ صرف مسکرا رہا

تھا بلکہ کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔راسپوتین نے بچے کی جان بچائی تو ملکہ اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ اسکی مرید بن گئی۔

اس واقعہ کے بعد راسپوتین کا ملکہ کے محل میں آنا جانا بڑھ گیا۔وہ نہ صرف بچے کا علاج کرتا بلکہ حکومت کے معاملات میں بھی دخل اندازی کرتا جس سے بادشاہ ناراض ہوتا لیکن ملکہ اور شہزادے کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتا۔آہستہ آہستہ راسپوتین کے دشمن بڑھتے گئے۔اس پر کئی دفعہ قاتلانہ حملے بھی ہوئے لیکن وہ پراسرار طریقے سے بچ جاتا۔آخر انہوں نے راسپوتین کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ راسپوتین نے زارِ روس کی تباہی اور لینن کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔راسپوتین اتنا مشہور اور بدنام ہوا کہ مرنے کے بعد وہ روس کے دیومالائی ادب کا حصہ بن گیا۔آج بھی بونی ایم BoneyM گروپ کا گانا ساری دنیا میں گایا جاتا ہے جس کا ایک شعر ہے

Ra Ra Rasputin, Russia's greatest love machin

Ra Ra Rasputin, lover of the Russian Queen

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے راسپوتین کے ملکہ سے کبھی بھی جنسی تعلقات نہیں تھے لیکن کلٹش شخصیت کی ایک یہ بھی خاصیت ہے کہ اس کی سوانح میں حقیقت اور افسانہ، سچ اور جھوٹ آپس میں ایسے خلط ملط ہوتے ہیں کہ ان کو جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں امریکہ میں بھی کئی کلٹش شخصیات مشہور ہوئیں جن میں سے بعض کے چند سو اور بعض کے لاکھوں پیروکار بنے۔ان میں سے ایک سنگ منگ مون Sung Myung Moon ہے جس کے پیروکار ''مونی'' کہلاتے ہیں۔وہ مون Moon کو اپنا پیغمبر سمجھتے ہیں۔مونی مون پر اتنا ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ایک مجمع میں لاکھوں پیروکاروں کی ایک

ہی وقت شادی کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ تو میاں بیوی ایک دوسرے کی زبان تک نہیں جانتے۔

شمالی امریکہ کی ایک اور کلٹش شخصیت ڈیوڈ برگ David Burg تھی۔ اس نے اپنے فلسفہِ حیات میں مذہب اور موسیقی، منشیات اور روحانیات کو یکجا کر دیا تھا۔ وہ اپنی مداح عورتوں کو طوائف بننے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ اس گروہ کا زوال اس وقت شروع ہوا جن برگ Burg نے بچوں سے بھی جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا۔ دھیرے دھیرے اس کے پیروکاروں کو جنسی بیماریوں نے آلیا اور سارا گروہ تتر بتر ہو گیا۔

امریکہ میں ایک اور کلٹش شخصیت نے شہرت پائی تھی جس کا نام ڈیوڈ کریش David Koresh تھا۔ وہ سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ Seventh Day Adventist کے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ کریش کا دعوہ تھا کہ وہ آخری مسیحا ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو بہت سی شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کریش کو اس وقت قانونی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جب اسکے پیروکاروں نے اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ آخر کریش کے پیروکاروں کا پولیس سے مقابلہ ہوا اور ۱۹ اپریل ۱۹۹۳ء کو کریش کے کمیون کو آگ لگا کر جلا دیا گیا۔

ہندوستان اور امریکہ کی ایک اور مشہور کلٹش شخصیت گرو راجنیش Guru Rajneesh تھی۔ راجنیش ایک زمانے میں ہندوستان میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ اس کی ساحرانہ شخصیت نے ہزاروں لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا۔ اس نے جب آزادانہ جنسی رویوں کی شمع جلائی تو یورپ اور شمالی امریکہ سے ہزاروں مرد اور عورتیں پتنگے بن کر اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ جب اس نے ہندوستان کی مدر ٹیریسا Mother Teresa اور مہاتما گاندھی Mahatama Gandhi جیسی شخصیات پر تنقید کرنی شروع کی تو ہندوستانیوں نے اسے ملک بدر کر دیا۔

ہندوستان سے نکل کر راجنیش نے امریکہ میں ڈیرے ڈالے۔ شروع میں تو ہزاروں

سرمایہ داروں اور آزادانہ طرزِ زندگی گزارنے والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے 99 روز رائسس Rolls Royces 99 کا ایک کارواں تیار کیا لیکن پھر اس پر برا وقت پڑا۔اس پر کئی مقدمات چلے اور ایک عدالت کے جج نے اسے ملک چھوڑنے کو کہا۔المیہ یہ تھا کہ راجنیش کو امریکہ ہی نہیں ہندوستان بھی اپنا شہری بنانے کے لئے تیار نہ تھا۔وہ زندگی کے آخری چند سال دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا اور آخر 1990 میں فوت ہو گیا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی موت ایڈزAIDS کی وجہ سے ہوئی تھی۔مرنے کے بعد اس کا آشرم ہندوستان میں بنایا گیا ہے جس کا رہنما آجکل ایک کنیڈین مرد ہے جو سوامی مائک Swami Mike کے نام سے جانا جاتا ہے۔وہ ایک مشہور کنیڈین جج کا بیٹا ہے۔اس آشرم کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ اس آشرم کی سالانہ کمائی پانچ کروڑ ڈالر ہے۔

بہت سی دیگر کلٹش شخصیات کی طرح جاوید اقبال کی شخصیت بھی ایک گورکھ دھندا ہے جس میں جنسیات اور روحانیات نے غیر اخلاقی اور غیر قانونی اعمال کا روپ دھار لیا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے

کیا وہ ایک مجرم ہے؟

کیا وہ ایک پاپی ہے؟

کیا وہ ایک برگزیدہ انسان ہے؟

کیا وہ اپنے معاشرے کو سنوارنا یا بگاڑنا چاہتا ہے؟

میں نے جاوید اقبال کی زندگی کے بارے میں جتنا غور وخوض کیا ہے مجھے اتنا ہی شدت سے احساس ہوا ہے کہ حقائق وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

سب لوگ حقائق کو رنگین عدسوں سے دیکھ رہے ہیں... جاوید اقبال اپنی نگاہ میں ایک

برگزیدہ انسان ہے جو

معاشرے کو بہتر بنانا چاہتا ہے

ہمسایوں کی نگاہ میں وہ ایک گناہگار انسان ہے

معاشرے کی نگاہ میں وہ ایک مجرم ہے

جج کی نگاہ میں وہ ایک شیطان ہے

جاوید اقبال کی زندگی میں آہستہ آہستہ حقیقت اور خواب، سچ اور جھوٹ، جنسیات اور روحانیات سب خلط ملط ہو گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کی جاوید اقبال کو مشہور ہونے کا بھی بہت شوق تھا اسی لئے اس نے 30 دسمبر 1999 کو ''جنگ'' اخبار کے دفتر جانے کا فیصلہ کیا تا کہ صدی کے آخری دن 31 دسمبر 1999 کو اسکی تصویر اخباروں کے صفحۂ اول پر چھپ سکے۔ اس اخبار نے اسے اپنی صدی کا عظیم ترین قاتل قرار دیا تھا۔

اوروں کی نگاہ میں چاہے وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو لیکن جاوید اقبال اپنی نگاہ میں ایک کامیاب انسان ہے۔

==========

سترھواں باب ... ہزاروں گمشدہ بچے

''بچے معاشرے کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو معاشرہ ان کے ساتھ کرتا ہے''

(کارل منگر)

جب میں نے جاوید اقبال کی کہانی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سوچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صرف ایک انسان کی کہانی نہیں وہ پوری قوم کی کہانی ہے۔

یہ کہانی

...ان خاندانوں کی بھی ہے جن کے بچے گم ہو گئے

...ان اساتذہ کی بھی ہے جن کے طالبعلم غائب ہو گئے

...اور ان پولیس سٹیشنوں کی بھی ہے جنہوں نے گمشدہ بچوں کو تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ بات حیرت کی ہے کہ سو گمشدہ بچوں میں سے ایک بچے کی بھی سارے ملک کے کسی پولیس سٹیشن میں رپورٹ نہ لکھوائی گئی تھی۔ بچوں کے والدین نے جج کو بتایا کہ جب انہوں نے پولیس کو رشوت نہ دی تو انہوں نے رپورٹ لکھنے سے انکار کیا۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری قوم ہی بے حس ہو گئی ہو

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبالؔ

پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن Human Rights Commission کے نمائندوں نے گمشدہ بچوں کے رشتہ داروں کے انٹرویو لینے کے بعد جو رپورٹ تیار کی تھی وہ ''ڈون''

اخبار Dawn میں چھپی تھی۔

''اسلام آباد کی 14 جون 2000 کی رپورٹ میں کمیشن نے معاشرے کی بے حسی کو ان سو بچوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے جو لاہور شہر میں قتل کر دئے گئے تھے۔کمیشن نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ پتہ چلے کہ وہ بچے معاشرے کے کس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔کمیشن کے ممبروں کا خیال ہے کہ ایک انسان کو اتنے بڑے سانحہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ان کی نگاہ میں بچوں کے والدین اور اساتذہ نے ہی نہیں پولیس نے بھی نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

کمیشن کی تحقیق سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ صرف صوبہ پنجاب میں ہی گمشدہ بچوں کی تعداد ایک سو نہیں چھ ہزار ہے۔اس گنتی میں باقی صوبوں کے گمشدہ بچے شامل نہیں ہیں۔

کمیشن کا مشورہ تھا کہ ملک میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں نہ صرف گمشدہ بچوں کی فہرست بنائی جائے بلکہ انہیں ذمہ داری سے تلاش بھی کیا جائے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سو بچے قتل نہیں ہوئے (جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے) تو پھر وہ کدھر گئے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں عرب ممالک بھیج کر انہیں عرب شیخوں کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا تا کہ وہ ان دوڑوں میں حصہ لے سکیں جن مین بچوں کو سفا کانہ طور پر اونٹوں سے باندھ دیا جاتا ہے اور پھر اونٹوں کو بھگایا جاتا ہے۔

کچھ اور لوگوں کو یقین ہے کہ بچوں کو مغرب کے ان سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا جو بچوں کے جسم کے اعضاء فروخت کرتے ہیں۔میں ابھی ان امکانات پر غور ہی کر رہا تھا کہ ٹورانٹو کے اخبار ''سن'' Toronto Sun میں 29 اکتوبر 2000 کو یہ خبر شائع ہوئی:

بچے کے اعضاء برائے فروخت

روس کی پولیس نے ایک نانی کو گرفتار کر لیا ہے جو اپنے نواسے کو فروخت کر رہی تھی تا کہ اس بچے کے اعضاء کسی اور انسان کو دئے جا سکیں۔اس نے بچے کو یہ بتایا تھا کہ وہ ڈزنی

لینڈDisney Land جارہا ہے۔ بچے کواس کا ماموں امریکہ لے جارہا تھا۔ جب پولیس نے ماموں سے پوچھا تو وہ کہنے لگا ''مجھے میری ماں نے کہا یہ میرا نواسہ ہے میں جو چاہے اس سے سلوک کروں تم اپنے کام سے کام رکھو''

روسی پولیس نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اس سے پہلے بھی وہ کئی ایسے لوگوں کو گرفتار کر چکے ہیں جو انسانی بچوں کے اعضاء کا کاروبار کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کاروبار روس میں ہوسکتا ہے تو کیا وہ پاکستان میں نہیں ہو سکتا؟

میں اس سوال پر کافی عرصے سے غور کر رہا ہوں۔

==========

اٹھارواں باب ... ہم جنس پسندی پر پابندی

ترجمہ۔ منصور حسین

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی روئے زمین پر ایسے مما لک موجود ہیں جہاں دو عاقل اور بالغ مردوں اور عورتوں کے درمیان بھی ہم جنس پسندی غیر قانونی قرار دی جاتی ہے۔ان روایت پرست مما لک کی بود و باش میں ہم جنس پسندی کی کوئی گنجائش نہیں سمجھی جاتی۔ان معاشروں میں ہم جنسی تعلقات کو غیر اخلاقی' غیر فطری اور گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ان معاشروں میں گے مردوں اور لیسبین عورتوں کو باعثِ شرم اور موردِ سزا گردان کر دھتکارا جاتا ہے۔ایسے ماحول میں گے مردوں اور لیسبین عورتوں کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نجانے کب معاشرے کا عتاب انہیں موردِ جلاوطنی یا گردن زدنی ٹھہرائے۔

ہم جنس پسندی کے خلاف یہ اشتعال انگیز رویہ ان مما لک کے عوام اور خواص کے اخلاقی اور مذہبی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ان کی اخلاقی اور مذہبی روایات نہ صرف ہم جنسی تعلقات کو قبول نہیں کرتیں بلکہ مردوں اور عورتوں کے درمیاں جنسی تعلقات کی بھی اسی وقت اجازت دیتی ہیں جب وہ مرد اور عورتیں شادی کے بندھنوں کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔ایسے روایت پرست معاشروں کے اکثر لوگ یہ تصور رکھتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے جنسی تعلقات کو واحد مقصد انسانی نسل کی افزائش ہے۔وہ جنسی تعلقات سے محظوظ ہونے کے حق میں نہیں ہیں۔

گزشتہ دو صدیوں کے دوران ترقی یافتہ مما لک نے' ترقی پسند معاشرتی روایتوں کے زیرِ اثر' گے اور لیسبین طرزِ زندگی کو رفتہ رفتہ قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔رجحانات کی اس تبدیلی میں مندرجہ ذیل عناصر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

1۔ مقبول عوامی شخصیات کا طرزِ زندگی منظرِ عام پر آیا اور ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں ان کی نشر واشاعت ہوئی۔ مثلاً آسکر وائلڈ کو ہم جنسی تعلقات رکھنے کے الزام میں جیل کی سزا ہوئی تو یورپ کے بہت سے ادیبوں، فنکاروں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اس سزا کے خلاف آواز اٹھائی۔ جب روک ہڈسن نے اپنے ایڈز AIDS کے مرض کا برملا اعتراف کیا تو بہت سے دیگر امریکی فنکاروں نے ہم جنسی کے بارے میں کھل کر بات چیت کرنی شروع کر دی۔

2۔ بیسویں صدی میں جنسیات اور ہم جنسی طرزِ زندگی کے موضوع پر لکھی جانے والی فکشن اور نون فکشن Fiction and Non-fiction تصنیفات نے عوام کی توجہ اس موضوع پر مرکوز کی۔

3۔ فرائڈ جیسے ماہرِ نفسیات نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم جنس پسندی ذہنی مرض نہیں ہے۔ اگرچہ ایسا طرزِ زندگی باعثِ ستائش نہیں ہے لیکن وہ قابلِ تضحیک بھی نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ انسان کے متنوع جنسی رجحانات کا ایک عنصر ہے۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا کی بہت سی عظیم شخصیتیں ہم جنس پسند تھیں۔

۴۔ ذہنی امراض کے ماہرین کے درمیان اس موضوع پر سنجیدہ بحث ہوئی کہ کیا ہم جنسی طرزِ زندگی کو غیر فطری سمجھا جائے یا نہیں۔ ایک وہ دور تھا جب ہم جنسی طرزِ زندگی کو بین الاقوامی ذہنی امراض کی فہرست میں شامل کیا جاتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ ماہرین اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جنس پسندی

ایک ایسا طرزِ حیات ہے جسے گے مرد اور لیسبین عورتیں اپنی مرضی سے اپناتے ہیں۔

5۔ ایسی تحریکیں معرضِ وجود میں آئیں جنھوں نے گے مردوں اور لیسبین عورتوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کی جس کے نتیجے میں مختلف ممالک کے قوانین میں تبدیلیاں وقوع پذیر

ہوئیں۔آہستہ آہستہ مغرب کے بیشتر ممالک میں گے مردوں اور لیسبین عورتوں کو روزمرہ زندگی میں خوف وہراس سے تحفظ حاصل ہوا۔

7۔آزاد خیال کلیساؤں نے نہ صرف گے پادریوں کو قبول کرلیا ہے بلکہ انہوں نے گے اور لیسبین جوڑوں کو گرجا گھروں میں شادی بیاہ کی رسومات پوری کرنے کا اختیار بھی دے دیا ہے۔

مغربی معاشرے میں وقوع پزیر ہونے والی ان تبدیلیوں کے باعث اب گے مرد اور لیسبین عورتیں برملا اپنے ہم جنس پسند ہونے کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے جنسی امتیاز اور طرزِ زندگی پر ندامت محسوس نہیں کرتے۔

گزشتہ صدی میں اگرچہ مغربی ممالک کے گے مردوں اور لیسبین عورتوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کافی پیش رفت کی ہے مگر پھر بھی بہت سے لوگ انہیں قانونی طور پر جوڑوں کی حیثیت دینے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔

افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کے بیشتر ممالک کے لوگوں کو علمِ جنسیات سے پوری طرح آگاہی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ان ممالک کے بیشتر اساتذہ سکولوں میں جنسی تعلیم کے حق میں نہیں ہیں اور اکثر والدیں اپنے بچوں سے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے کتراتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے نوجوان ہی نہیں معمر لوگ بھی اس موضوع پر لاعلمی کا شکار ہیں۔ان ممالک میں بہت سے گے مرد اور لیسبین عورتیں خوف وہراس کی زندگی گزارتے ہیں۔بعض اپنے جذبات کو اس قدر دبا کر رکھتے ہیں کہ وہ ذہنی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں اور شادی کرکے اپنے شہوانی جذبات کو محبوس کرلیتے ہیں۔ان میں سے بعض کے دبائے ہوئے جنسی اور رومانوی جذبات آہستہ آہستہ غصے، نفرت اور تلخی میں ڈھل جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں اپنے خاندان اور معاشرے کے لئے انتقامی جذبات ابھرنے لگتے ہیں اور وہ دوسروں کو اذیت

دے کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔

یہ ایک اندوہناک حقیقت ہے کہ دنیا میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جو ایڈز کی مرض کا شکار ہیں اور مر رہے ہیں لیکن نہ تو ان تک جنسی تعلیم پہنچی ہے اور نہ ہی حفظانِ صحت کے اصول۔ دنیا کے لاکھوں لوگ حقائق سے چشم پوشی کرر ہے ہیں۔

مجھے کئی دفعہ اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ تیسری دنیا لے مما لک کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ

☆ نوجوانوں کی جنسی تعلیم کو تدریسی نصاب کالازمی جزو قرار دیں

☆ تعلیمِ بالغاں میں حفظانِ صحت کی تدریس سے جنسی تعلقات سے پھیلنے والی بیماریوں (آتشک' سوزاک' ایڈز وغیرہ) کی روک تھام کریں

☆ ایڈز کے مریضوں کا احترام سے علاج کریں

☆ اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی پر جنسیات کے موضوع کو زیرِ بحث لائیں اور ہم جنس پسندی کے بارے میں عوام کو باخبر کریں۔

مجھے امید ہے کہ تیسری دنیا کے مما لک میں وہ دن بھی آئے گا جب وہاں گے مرد اور لیسبین عورتیں عزت اور آبرو سے زندگی گزار سکیں گے اور عوام وخواص ان کے طرزِ زندگی کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرلیں گے۔ میں پر امید ہوں کہ ہم ایک ایسا ماحول تیار کرنے میں کامیاب ہوں گے جب گے اور لیسبین جوڑے کسی قسم کا خوف وہراس محسوس نہیں کریں گے۔

مغرب میں سال میں ایک دن گے مرد اور لیسبین عورتیں سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور اپنی پریڈ Gay Pride Parade سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب ان کے لئے ان کا طرزِ زندگی باعثِ افتخار ہے جبکہ مشرق میں اب تک گے مرد اور لیسبین عورتیں موردِ عتاب ہیں اور اکثر لوگ نابالغ بچوں کے ساتھ ہم جنسی تعلقات اور دو عاقل اور بالغ جوان مردوں اور جوان عورتوں

کے تعلقات میں تمیز نہیں کرتے۔ وہ دونوں قسم کے جنسی تعلقات کو غیر قانونی جرم سمجھتے ہیں۔ میں نے جب یہ سوال سپریم کورٹ کے وکیل عابد حسن منٹو سے پوچھا تو وہ فرمانے لگے'' قانون کی نگاہ میں بچوں کے ساتھ ہم جنسی تعلقات اور دو جوانوں کے باہمی رضامندی سے تعلقات میں کوئی فرق نہیں۔ قانون کی نگاہ میں دونوں مجرم اور سزا کے مستحق ہیں''۔

میں نے مقامی اخباروں میں کئی ایسی خبریں پڑھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ بہت سے لوگوں کو ہم جنسی تعلقات کی وجہ سے نہ صرف بھاری جرمانہ ہوا بلکہ کئی سال کی قید کی سزا بھی ملی۔

==========

انیسواں باب ... سائیکوپیتھک شخصیت کا معمہ

ترجمہ منصور حسین۔خالد سہیل

''اس کا ہاتھ سب انسانوں کی گردن پر ہوگا

اور سب انسانوں کا ہاتھ اس کی گردن پر ہوگا''

بائبل

سائیکوپیتھک شخصیات کے حامل انسان صدیوں سے عوام اور خواص دونوں کے لئے ایک معمہ رہے ہیں۔ایسے لوگ صحیح اور غلط کا فرق جاننے کے باوجود غلط راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ایسے لوگ اپنی غیر مہذب اور غیر اخلاقی حرکات کی وجہ سے اپنے خاندانوں اور اپنے معاشروں کے لئے بہت سے جذباتی اور معاشرتی مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔بدقسمتی سے ایسے انسان نہ تو کوئی شرم محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی احساسِ جرم ہوتا ہے۔ان کے جاننے والے نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ایسے لوگوں میں سے بہت سے قانون شکنی کے بعد جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دئے جاتے ہیں کیونکہ جج انہیں دماغی امراض کے ہسپتال بھیجتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ ماہرین نفسیات ان کا علاج کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ڈِی ہنڈرسن نے اپنی کتاب Psychopathic States(1939) میں تحریر کیا تھا ''جج ایسے لوگوں کو جیل بھیجنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ پاگل خانے کا ڈاکٹر ایسے شخص کو ہسپتال میں داخل کرنے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اسکا علاج نہیں کرسکتا''۔

تاریخی پس منظر:

اگرچہ Psychopsthic, Sociopathic, Antisocial اصطلاحیں جدید دور کی پیداوار ہیں لیکن ایسی شخصیات کا بیان تاریخی کتابوں میں پہلے سے ملتا ہے۔انجیل میں لکھا ہے ''اسکی زبان پر جھوٹ اور خرافات ہوتے ہیں۔وہ لوگوں کو دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔وہ بستیوں کے قریب چھپ کر معصوموں کا انتظار کرتا ہے جیسے شیر اپنے شکار کی تاک میں رہتا ہے۔وہ مجبور اور بے سہارا لوگوں کو گھسیٹ کر اپنی کچھار میں لے جاتا ہے۔وہ ان کو کچل دیتا ہے۔بے بس لوگ نڈھال ہو کر اس کی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔''

ارسطو کے ایک شاگرد Theophrastus نے ایک شخصیت کو Unscrupulous Man کا نام دیا تھا اور اسے ان الفاظ میں بیان کیا تھا ''وہ لوگوں سے قرض مانگتا ہے لیکن قرض واپس نہیں کرتا۔وہ قصاب سے گوشت خریدتے ہوئے اپنی کسی خدمت کی یاددہانی کراتا ہے تا کہ وہ اسے زیادہ گوشت دے اور اگر وہ نہیں دیتا تو یہ جاتے ہوئے ہنسی مذاق کرتا ہوا ایک دو ہڈیاں اور بوٹیاں لے اڑتا ہے''۔

جب ہم ذہنی بیماریوں کے جدید دور کی طرف آتے ہیں تو ہماری ملاقات Philippe Pinel سے ہوتی ہے جس نے انیسویں صدی کے اوائل میں ایسی شخصیات پر توجہ مرکوز کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے لوگ ایسے اعمال کرتے ہیں جن سے انہیں خود بہت نقصان ہوتا ہے۔ان کی سوچ منطقی ہوتی ہے لیکن اعمال نہایت غیر مہذب اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔Pinel نے ایسی شخصیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا ''انکے اعمال مریضانہ ہوتے ہیں لیکن وہ ذہنی مریض نہیں ہوتے۔ان کا نہ تو ضمیر ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔انہیں دوسروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔انکے اعمال نہایت خودغرضانہ ہوتے ہیں اور وہ ساری عمر دوسروں کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔انکے دل میں مروجہ اخلاقیات کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔''

امریکی ڈاکٹر Benjamin Rush نے بھی انیسویں صدی میں ایسی شخصیات کا

ذکر کیا تھا جو ذہنی طور پر اچھے برے کی تمیز جانتے تھے لیکن جذباتی طور پر غیر اخلاقی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔اس کا خیال تھا کہ ایسے لوگ پیدائشی طور پر اخلاقی کجروی کا شکار ہوتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ماہرین کو اس حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسی شخصیات کے دو جداگانہ پہلو ہوتے ہیں۔نفسیاتی اور معاشرتی۔نفسیاتی طور پر وہ احساسِ شرم اور احساسِ جرم سے عاری ہوتے ہیں اور معاشرتی طور پر وہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکات کرتے رہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ایک برطانوی ماہرِ نفسیات جے پرچرڈ Prichard نے ایسے لوگوں کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کی۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ ''اخلاقی پاگل پن'' کا شکار ہیں۔وہ ان شخصیات کے بارے میں لکھتا ہے''یہ ایک ایسی ذہنی بیماری ہے جس میں اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں تو متاثر نہیں ہوتیں لیکن انسان کے جذباتی فیصلے اور کردار بہت متاثر ہوتے ہیں۔انسان اخلاقی اقدار سے کنارہ کش ہو کر بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے''۔

ماہرین کی ایسی تحریروں سے واضح ہو گیا کہ پاگل پن دو طرح کا ہے... روایتی پاگل پن جس میں انسان توہمات (delusions) غیبی آوازوں (hallucinations) کا شکار ہو جاتا ہے اور اخلاقی پاگل پن جس میں انسان اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک ماہرین یہ سوچنے لگے تھے کہ عین ممکن ہے اخلاقی پاگل پن پیدائشی ہو اور اس کا بچے کی تربیت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لومبروسو Lombrosa ان کو پیدائشی مجرم Born Delinquent کہا کرتا تھا اور برطانوی ماہرِ نفسیات ہنری موڈزلی Henry Maudsley نے ان کے بارے میں لکھا تھا''جس طرح کچھ لوگ پیدائشی طور پر رنگوں میں تفریق نہیں کر سکتے اور رنگوں کے نابینا colour blind ہوتے ہیں اسی طرح بعض لوگ پیدائشی طور پر اخلاقی اقدار کے احساس سے محروم ہوتے ہیں''۔

انیسویں صدی کی اصطلاح moral insanity بیسویں صدی تک آتے آتے

psychopathic personality میں بدل گئی۔

بیسویں صدی میں کرافٹ ایبنگ KraftEbbing نے ان شخصیات کی جنسی زندگی پر توجہ مرکوز کی اور ثابت کیا کہ ایسے لوگوں کے رومانوی رشتوں میں محبت کی بجائے شہوت کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔وہ جنس کے حوالے سے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ہیولاک ایلس Hadvelock Ellis نے بھی ثابت کیا کہ ایسے لوگ دوسرے انسانوں کو جنسی دکھ پہنچا کرخوش ہوتے ہیں۔

کریپلن Kraeplin نے اپنی تحریروں میں لکھا کہ ایسے لوگ پیدائش سے ہی نفسیاتی طور پر مریض ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات اور انا کی تسکین کے لئے جارحانہ اور غیر اخلاقی اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔کریپلن کا خیال تھا کہ یہ خصوصیات ساری عمر رہتی ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک ماہرین یہ ماننے لگے تھے کہ ایسی شخصیات پیدائشی طور پر اخلاقی مریض ہوتی ہیں اور ان کی تربیت یا نفسیاتی علاج سے اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

کرٹ شنائڈر Kurt Schneider نے ۱۹۲۳ء میں اپنی کتاب Psychopathic Personalities میں ایسی شخصیتوں کی طرزِ زندگی کے بارے میں لکھا تھا ''ایسے لوگ نہ شرم محسوس کرتے ہیں نہ احساسِ گناہ۔ان کا ضمیر انہیں کچھ کے نہیں لگاتا اس لئے وہ تمام عمر جرائم کرتے رہتے ہیں''۔شنائڈر نے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا کہ ایسے لوگ نہ صرف معاشرے کے لئے مسائل کھڑے کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال سے ان کے بچے اور گھر والے بھی پریشان رہتے ہیں۔وہ اپنے خاندانوں کی زندگی بھی عذاب بنائے رکھتے ہیں۔

بعض ماہرینِ نفسیات ایسے لوگوں کے بارے میں اتنے پریشان تھے کہ انہوں نے مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں کو خصی sterilize کر دینا چاہئے تاکہ وہ مزید بچے نہ پیدا کر سکیں۔

1925 میں اگوسٹ ایکورن August Aichorn نے سائیکوپیتھک شخصیات کی تحلیلِ نفسی کے بعد لکھا کہ ایسے لوگ خاندان اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کو جذباتی طور پر قبول کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔ ولہیم رائخ Wilhelm Reich کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں کا ضمیر اور super-ego نہیں ہوتے اسی لئے انہیں اپنے کسی عمل پر احساسِ گناہ نہیں ہوتا۔

1935 میں ماہرِ نفسیات فرینز الیگزینڈر Franz Alexander نے اپنی کتاب The Roots Of Crime میں لکھا کہ ایسی شخصیتوں کو بچپن میں جو تکلیفیں پہنچتی ہیں وہ آہستہ آہستہ غصے' نفرت اور تلخی کے جذبات میں ڈھل جاتی ہیں اور وہ اپنے معاشرے سے بدلہ لینے لگتے ہیں۔

1950 کی دہائی میں ہاروی کلیکلی Harvey Cleckley کی کتاب The Mask Of Sanity ایسی شخصیات کو سمجھنے میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کلیکلی نے اس کتاب میں سائیکوپیتھک شخصیت کے مالک لوگوں کی کہانیاں لکھیں اور یہ ثابت کیا کہ ایسے لوگ صرف مجرموں کی صفوں میں ہی کھڑے نظر نہیں آتے بلکہ کئی کامیاب بزنس مین' سیاستدان حتیٰ کہ کامیاب ڈاکٹر بھی ایسی شخصیت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف اس وجہ سے پہچانے نہیں جاتے کیونکہ وہ قانون کی ضد میں نہیں آتے۔ کلیکلی کا خیال تھا کہ ایسے لوگ ایک نارمل زندگی کا روپ یا بہروپ mask پہن کر لوگوں کو عمر بھر دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

بی برسٹن B.Burston اور ایرک فرام Eric Fromm نے 1970 کی دہائی میں ایسی شخصیات کے بارے میں بہت کچھ تحریر کیا۔ برسٹن کا خیال تھا کہ ایسے لوگ اپنی سحر انگیز شخصیات کی وجہ سے سادہ لوح لوگوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتے ہیں اور پھر ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ فرام کا کہنا تھا کہ ایسے لوگ دوسرے لوگوں کو اپنے الفاظ اور اعمال سے ذہنی دکھ پہنچاتے رہتے ہیں۔ جسمانی زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں لیکن دل کے زخم مندمل ہونے میں دیر

لگتی ہے۔ایسے لوگوں کو دوسروں کے جذبات کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔

ڈی شپیرو D.Shapiro نے 1980 کی دہائی میں فرام سے اتفاق کیا کہ ایسے لوگ پہلے دوسروں کو بے بس اور مجبور بناتے ہیں اور پھر ان کا استحصال کرتے ہیں۔

اوٹو کرنبرگ Otto Kernberg نے بھی 1980 کی دہائی میں ایسے لوگوں پر اپنی توجہ مرکوز کی اور ان کی شخصیات کے نرگسیت کے پہلو کو اجاگر کیا۔اس نے بتایا کہ ایسے لوگ بہت انا پرست اور خود غرض ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے جذبات کا بالکل احترام نہیں کرتے۔کرنبرگ نے یہ بھی ثابت کیا کہ ایسے لوگوں کا غصہ کیسے نفرت، تلخی اور بدلہ لینے کے جذبات میں تبدیل ہوتا ہے اور وہ کیسے معاشرے کے لئے خطرناک بن جاتے ہیں۔

رابرٹ ہیر Robert Hare نے 1980 کی دہائی میں کلیکلی کی کتاب کو بنیاد بنا کر ایک ایسا سوال نامہ تیار کیا جس کی مدد سے ماہرینِ نفسیات، پولیس افسر اور جیلوں میں کام کرنے والے لوگ ایسی شخصیات کو پہچان سکتے ہیں اور ان کی تشخیص کر سکتے ہیں۔

Classification:

پچھلی چند دہائیوں مین ماہرینِ نفسیات سائکوپیتھک شخصیت کی مختلف اقسام کی تلاش میں ہیں۔1940 کی دہائی میں Psychopathic Personality Disorder کی اصطلاح مقبول تھی۔1950 کی دہائی میں Socio-pathic Personality Disorder کی اصطلاح مقبول ہوئی اور 1960 کی دہائی سے ماہرین Anti-social Personality Disorder کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔اصطلاح جو بھی ہو ان سب کا مرکز وہ لوگ ہیں جو نفسیاتی طور پر احساسِ شرم اور احساسِ جرم سے بیگانہ ہوتے ہیں اور معاشرتی طور پر غیر اخلاقی اور غیر قانونی اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تشخیص Diagnosis:

پچھلی دو دہائیوں میں ہیر Hare نے جو سوال نامہ تیار کیا ہے وہ بہت مقبول ہوا ہے۔ بہت سے ماہرین جو نفسیاتی ہسپتالوں اور جیلوں میں کام کر رہے ہیں وہ اس کی روشنی میں مریضوں اور ان کے رشتہ داروں کا انٹرویو لیتے ہیں۔ اس سوال نامے میں بیس سوال اور بیس انسانی خصوصیات ہیں۔ ہر سوال اور خصوصیت کے دو نمبر ہیں۔ اگر کسی شخص میں وہ خصوصیت نہ ہو تو اس کے صفر نمبر' اگر وہ خصوصیت تھوڑی سی ہو تو ایک نمبر اور اگر وہ خصوصیت بدرجہِ اتم موجود ہو تو دو نمبر۔ اگر کوئی شخص چالیس میں سے تیس نمبر لے لے تو ماہرین اس شخص کو سائیکو پیتھک شخصیت کا مریض سمجھتے ہیں۔ وہ بیس خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ شخصیت کی سطحی کشش

2۔ غرور و تکبر

3۔ تفریح کی غیر موجودگی میں جلد بور ہو جانا

4۔ حد سے زیادہ جھوٹ بولنا

5۔ مکاری اور چالبازی

6۔ احساسِ شرم اور احساسِ جرم کا فقدان

7۔ خوشی اور غم کا سطحی پن

8۔ اوروں سے ہمدردی کا فقدان

9۔ اوروں کے سہارے زندگی گزارنا

10۔ جلد آپے سے باہر ہو جانا

11۔ بہت سے لوگوں سے بیک وقت جنسی تعلقات قائم رکھنا

12۔ اوائلِ عمر سے ہی بے راہ روی

13۔ بے مقصد زندگی گزارنا

14۔ بغیر سوچے سمجھے کام کرنا

15۔ غیر ذمہ داری کی زندگی گزارنا

16۔ اپنے اعمال کے نتائج کو قبول نہ کرنا

17۔ بہت سی مختصر شادیاں کرنا

18۔ نوجوانی سے ہی جرائم پیشہ زندگی گزارنا

19۔ جیل سے نکل کر دوبارہ جرائم کرنا

20۔ مختلف اقسام کے جرائم کرنا

ہیر کا خیال ہے کہ یہ بجا کہ سائیکوپیتھک شخصیت کے مالک غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکتیں کرتے ہیں لیکن سب غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرنے والے سائیکوپیتھ نہیں ہوتے۔

اسباب Etiology:

ماہرین ایک طویل عرصے سے اس معمے کا حل تلاش کر رہے ہیں کہ سائیکوپیتھک شخصیت میں پیدائشی عوامل اور تربیت کس حد تک اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

موروثی عوامل Genetic Factors:

جن ماہرین نے جڑواں بچوں پر تحقیق کی ہے ان کا کہنا کہ سائیکوپیتھک شخصیت میں موروثی اثرات اہم ہیں Monozygotic Twins میں وہ اثرات تقریباً پچاس فیصد اور Dizygotic twins میں وہ اثرات تقریباً بیس فیصد تھے۔

حیاتیاتی عوامل Biological Factors:

بعض ماہرین نے نارمل لوگوں کے دماغوں اور سائیکوپیتھک شخصیت کے مالک لوگوں کے

دماغوں کا مقابلہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ سائیکوپیتھ لوگوں کے دماغ کے سامنے کے حصوں Frontal Lobes میں کچھ کجی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ معاشرے کی اخلاقی اقدار کا احترام نہیں کرتے اور نہ صرف جارحانہ رویہ رکھتے ہیں بلکہ غیر قانونی اعمال کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔

نفسیاتی عوامل Psychological Factors:

صحتمند بچے اپنے خاندانوں سے صحیح اور غلط کی تمیز سیکھتے ہیں۔ والدین صحیح کام کی تعریف کرتے ہیں اور پیار محبت سے صلہ دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور سزا دیتے ہیں۔ اس طرح بچے کا ضمیر تربیت پاتا ہے۔ جو بچے اپنے والدین خاص کر اپنے باپ کے سائے سے محروم رہتے ہیں ان کی شخصیت صحیح نہیں پنپتی۔ 1986 میں ایک تحقیق کے نتائج چھپے تھے جس کے تحت امریکہ میں سنجیدہ جرائم کے مرتکب لوگوں میں سے 70 فی صد ایسے تھے جو اپنے والد کے سائے سے محروم رہے تھے۔

روبنز Robins نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ جو والدین خود غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکات کرتے ہیں ان کے بچے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

سماجی عوامل Social Factors:

بچوں کی تربیت میں ان کا معاشرتی اور سماجی ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ بچے جو ایسے سکولوں اور ایسے اداروں میں پلے بڑھے ہوں جہاں اخلاقی اقدار کا فقدان ہو وہ بھی بڑے ہو کر غیر اخلاقی اور غیر قانونی طرزِ زندگی اپناتے ہیں۔

ثقافتی عوامل Cultural Factors:

ماہرین کے لئے ثقافتی عوامل پر تحقیق کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ مرفی Murphy

نے بہت سے پرانے قبیلوں میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ جدید طرزِ زندگی سے بیگانہ قبیلے بھی ایسے لوگوں سے واقف تھے جو اپنے معاشرے کی روایات کا احترام نہ کرتے تھے اور ان کے اعمال کی وجہ سے باقی لوگ تکلیفیں برداشت کرتے تھے۔ ان قبائل کے بزرگ shamans جانتے تھے کہ ان لوگوں کا علاج نہیں ہوسکتا۔ ایسے لوگوں کو شکار کی دعوت دی جاتی تھی اور پھر انہیں چپکے سے برف میں دھکیل دیا جاتا تھا جہاں وہ مر جاتے تھے اور ان کا قبیلہ ان سے نجات حاصل کر لیتا تھا۔

علاج Treatment:

بیشتر ماہرینِ نفسیات سائیکوپیتھ لوگوں کا علاج کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ان کی نگاہ میں ایسے لوگ لاعلاج ہیں۔

انفرادی علاج Individual Therapy:

جن ماہرین نے ایسے لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسے لوگوں کے علاج کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ فلسفیانہ مکالمے میں الجھنے کی بجائے انہیں صاف الفاظ میں بتایا جائے کہ ان کے اعمال غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہیں اور ان کی مدد کی جائے کہ وہ قوانین اور اقدار پر عمل کریں۔ ان مریضوں کو بار بار اس چیز کی یاد دہانی کرانی پڑتی ہے کہ اگر انہوں نے قوانین کا احترام نہ کیا تو وہ معاشرے میں رہنے کی بجائے جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزاریں گے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ علاج کا مقصد ان کی شخصیتوں کو بدلنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کے نقصان دہ اعمال سے دوسروں کو بچانا ہونا چاہئے۔ کرن برگ Kernberg نے علاج کرنے والے ماہرین کو نصیحت کی ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے گفتگو میں اپنے اخلاقی معیار پر سختی سے کاربند رہیں۔

اداروں میں علاج Institutional Care:

ایسے لوگوں کو ہسپتالوں میں علاج کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ ہسپتال کا نظام درہم برہم کر دیتے ہیں۔بعض دفعہ تو دیگر مریضوں اور سٹاف کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔میکسول جونز Maxwell Jones نے 1940 کی دہائی میں ایسے لوگوں کے علاج کے لئے تھیراپیوٹک کمیونٹی Therapeutic Community کا تصور پیش کیا تھا۔اس طریقہِ علاج میں نرسیں اور ڈاکٹر خود مریضوں کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ وارڈ کے قوانین بنائیں اور پھر ان پر عمل کریں۔اس طرح مریض ایک دوسرے کا محاسبہ کرتے ہیں۔یہ طریقہِ علاج نفسیاتی ہسپتالوں میں مقبول ہوا،اور انگلستان کے ہنڈرسن ہسپتال Henderson Hospital نے اس طریقہِ علاج پر بہت تحقیق کی اور نتائج چھاپے۔ان کا کہنا ہے کہ اس طریقہِ علاج کے نتائج روایتی طریقہِ علاج سے بہت بہتر ہیں۔اس ہسپتال سے نکلے ہوئے مریضوں کا جب کئی سالوں کے بعد معائنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان میں سے 41 فی صد تین سال کے بعد بھی 36 فی صد پانچ سال کے بعد بھی صحتمند زندگی گزار رہے تھے اور غیر قانونی حرکات کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔اس ہسپتال میں مریضوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ وہاں چھ سے نو مہینے رہ کر اپنا علاج کروائیں۔

تھیراپیوٹک کمیونٹی کے علاج کی کامیابی کے بعد اب اس طریقہِ علاج کو جیلوں میں بھی متعارف کروایا جا رہا ہے۔وہ جیلیں جو اس طریقہِ علاج کو اپنا رہی ہیں اور قیدیوں کا جدید طریقے سے علاج کر رہی ہیں وہ تھیراپیوٹک پرزنز Therapeutic Prisons کہلاتی ہیں۔ان جیلوں میں قیدیوں کو ذمہ داریاں دی جاتی ہیں اور انہیں چند اختیارات دئے جاتے ہیں تا کہ وہ ثابت کریں کہ وہ ایک ذمہ دارانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ایسی جیلوں کے ماہرین قیدیوں اور مریضوں سے احترام سے پیش آتے ہیں اور ان سے معاہدہ کرتے ہیں کہ مراعات حاصل کرنے

کے لئے انہیں دوسرے انسانوں' قوانین اور اخلاقی اقدار کا احترام کرنا پڑے گا۔

کلیکلی نے 1941 میں لکھا تھا کہ سائیکوپیتھک شخصیت کے مالک لوگوں کو سمجھنے اور اس کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہم سب کو مل کر سوچنا ہوگا۔ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے معاشرے میں وکیلوں' سوشل ورکروں' اساتذہ' سیاستدانوں اور ماہرینِ نفسیات کو اکٹھے ہونا ہوگا اور ایسا نظام تخلیق کرنا ہوگا جہاں ایسے لوگوں کی عزتِ نفس کا بھی احترام کیا جائے اور معاشرے کو بھی ان کے نقصان دہ اعمال سے بچایا جائے۔امریکہ کے جج چارلز گلCharles Gill نے1994 میں کہا تھا کہ یہ لوگ ہم میں سے ہی ہیں۔یہ کہیں باہر سے نہیں آئے۔یہ ہمارے خاندانوں اور سکولوں میں پلے بڑھے ہیں۔ہم نے ہی ان کی تربیت کی ہے اور اب ہمیں ہی ان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ان کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے ہم اپنے مسائل کا حل تلاش کر رہے ہونگے۔

میرا خیال ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی اور تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو سولی پر چڑھا دیں اور یا ان کے مسائل کا سنجیدگی سے حل تلاش کریں۔ہم سب کے لئے یہ لمحہِ فکریہ ہے۔مجھے امید ہے کہ ہم سب انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے اپنے مسائل کا سنجیدگی سے حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

==========

بیسواں باب ... جاوید اقبال اور عالمی سیریل قاتل

جب میں جاوید اقبال کی ڈائری پڑھ رہا تھا تو میں اپنے ذہن میں اسکا ساری دنیا کے سیریل قاتلوں سے موازنہ کر رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اس کی زندگی اور دیگر سیریل قاتلوں کی زندگی میں بہت سی مماثلتیں نظر آئیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ عجیب وغریب وضاحتیں:

سب سیریل قاتل اپنے اعمال کی عجیب وغریب وضاحتیں پیش کرتے ہیں اور وہ وضاحتیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بادلوں کی طرح بدلتی رہتی ہیں شاید اس لئے کہ وہ قاتل خود اپنے شعوری اور لاشعوری محرکات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔

جاوید اقبال نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا تھا کہ مجھے قتل کرنے والوں نے میری ماں کو اتنا دکھ پہنچایا کہ وہ فوت ہوگئیں۔ اب میں اپنی ماں کی موت کا بدلہ لینے کے لئے سو لڑکوں کو ماروں گا تاکہ ان کی مائیں بھی میری ماں کی طرح دکھی ہوں اور ساری عمر آنسو بہاتی رہیں۔

پولینڈ کے لوسئین سٹینیک Lucian Staniak نے بھی عورتوں کو قتل کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنے ماں باپ کی موت کا بدلہ لے رہا ہوں۔ اس کے ماں باپ ایک کار کے حادثے میں فوت ہوگئے تھے۔ جس کار نے انہیں مارا تھا اسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ اسی لئے لوسئین عورتوں کے خلاف ہوگیا تھا۔ وہ ہر نئے قتل سے پہلے پولیس کو اپنی نئی نظم بھیجتا تھا جس میں اس نے اپنے اگلے قتل کی پیشین گوئی کی ہوتی تھی۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت کے تاریخ رخ کی عکاسی کرتی تھی۔

زندگی میں خوشیاں آنسوؤں کی مرہونِ منت ہیں
موت کے بغیر زندگی ناممکن ہے

کسی کے جنازے میں شمولیت ہمیں چھٹی لینے پر مجبور کرتی ہے

جرمنی کا سیریل قاتل پیٹر کرٹن Peter Kurten کہا کرتا تھا کہ وہ مردے کے جسم سے خون بہتا دیکھ کر جنسی لذت محسوس کرتا تھا۔

2۔خاص پیغام:

اکثر سیریل قاتل دنیا کو اپنا پیغام دینا چاہتے ہیں۔اسی لئے وہ جرنلسٹوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔کلفرڈ اولسن Clifford Olsen جس نے ۱۹۸۲ء میں گیارہ قتل کرنے کا اقرار کیا تھا' کئی سالوں سے اپنا فلسفہِ حیات لکھ رہا ہے جس میں وہ محبت سے ابدی زندگی تک سب موضوعات پر اظہارِ خیال کر رہا ہے۔پینز مین Panzman نے اپنی پھانسی کی سزا سے پہلے لکھا تھا ''میرا نہ تو خدا پر ایمان ہے نہ شیطان پر۔میں ساری انسانیت سے نفرت کرتا ہوں۔میں ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کا شکار کرتا رہا ہوں۔میرا ایمان ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔سیریل قاتل نہ تو فلاسفر ہوتے ہیں نہ دانشور لیکن پھر بھی وہ ساری دنیا کو اپنا پیغام دینا ضروری سمجھتے ہیں۔بدقسمتی سے وہ اپنا پیغام دینے کے لئے قلم کی بجائے تلوار استعمال کرتے ہیں۔جاوید اقبال اپنے بچپن میں ایک جرنلسٹ بن کر قوم کو سنوارنے کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے تباہی کا راستہ اختیار کر لیا۔

3۔تضادات:

سیریل قاتلوں کی شخصیات اور زندگیاں تضادات سے پر ہوتی ہیں۔

کبھی وہ بہت سخی ہوتے ہیں کبھی بہت کنجوس

کسی سے وہ محبت کرتے ہیں کسی سے نفرت

چارلز سٹیکو یتھر Charles Steakweather انسانوں سے نفرت لیکن

فطرت سے محبت کرتا تھا۔ وہ انسانوں کو قتل کرتا تھا اور جانوروں کی زندگیاں بچاتا تھا۔

بہت سے ماہرینِ نفسیات نے ان تضادات کی گتھیاں سلجھانے میں ایک عمر گزار دی ہے۔

جاوید اقبال اپنی ڈائری میں سو بچوں کے قتل کے منصوبے بھی لکھتا تھا اور بچوں سے محبت کرنے کا دعوہ بھی کرتا تھا۔

4۔ نفسیاتی وجوہات:

سیریل قاتلوں کے قتل کرنے کی نفسیاتی وجوہات میں ہمیں چند قدریں مشترک ملتی ہیں

پہلی قدر بدلہ لینے کا جذبہ ہے۔ ان کا غصہ اور نفرت انہیں بدلہ لینے پر اکساتے رہتے ہیں لیکن یہ بدلہ لینے کا جذبہ ایک شخص کی بجائے ایک گروہ پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے کیونکہ وہ اس گروہ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اس گروہ کو تباہ و برباد کرنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی بدلہ لینے کے جذبے سے وہ بہت سے معصوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہتے ہیں۔

ایڈمنڈ کمپر Edmund Kemper کا غصہ امیروں کے خلاف تھا۔ اسی لئے اس نے کئی معصوم سرمایہ داروں کو قتل کر ڈالا۔

مارک ایسکس Mark Essex کا غصہ گوروں کے خلاف تھا کیونکہ اس کے ساتھ امریکی نیوی Navy میں کالا ہونے کی وجہ سے ناانصافیاں ہوئی تھیں اور اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

جیمز ہیبرٹی James Huberty نے کیلی فورنیا کے میکڈانلڈ McDonald سٹور میں ہسپانوی نژاد لوگوں کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ وہ انہیں اپنی بیروزگاری کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

البرٹ ڈیسلوو Albert Desalvo اور تھیوڈور بنڈی Theodore

Bundy کو عورتوں سے اتنی نفرت تھی کہ پہلے وہ ان پر ہر طرح کے مظالم کرتے تھے اور پھر انہیں قتل کر دیتے تھے۔

جاوید اقبال نے اپنے غصے' نفرت اور بدلہ لینے کا نشانہ پٹھانوں کو بنایا تھا کیونکہ وہ انہیں اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا لیکن جب ہم پولیس کی رپورٹیں پڑھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہ پہلی دفعہ جیل گیا تھا تو اس نے اس وقت بھی ایک پٹھان خاندان کے پٹھان لڑکے سے جنسی تعلقات قائم کئے تھے اور پکڑا گیا تھا۔

5۔احتجاج:

بہت سے سیریل قاتل اپنی بے مقصد کی زندگی سے تنگ آ جاتے ہیں اور کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جب انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ مثبت طریقوں سے مشہور نہیں ہو سکتے تو وہ اپنے احتجاج میں منفی طریقے استعمال کرتے ہیں جو ان کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی۔

6۔غیر انسانی حرکات:

سیریل قاتل ایک موقع پر اپنی زندگی کے ایسے موڑ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے ضمیر مر جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں احترامِ آدمیت کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دوسرے معصوم انسانوں کا' چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں' امیر ہوں یا غریب' بوڑھے ہوں یا بچے' خون بہانے سے نہیں ڈرتے۔ان کے لئے انسان انسان نہیں رہتے بلکہ ایک ایسی علامت' ایک ایسا استعارہ بن جاتے ہیں جنہیں وہ تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ بعض قاتل ان معصوم انسانون کی موت کو فن کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ فن بھی ان کے ذہنوں کی طرح تباہی اور ہلاکت کی علامت بن جاتا ہے اور ان کے دل پتھر کے ہو جاتے ہیں۔

7۔مشہور ہونے کی خواہش:

سیریل قاتلوں کو مشہور ہونے کی بہت خواہش ہوتی ہے۔وہ ریڈیو اور ٹی وی پر انٹرویو دینے کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔شہرت حاصل کرنے کے لئے وہ من گھڑت کہانیاں بھی بناتے رہتے ہیں۔وہ جھوٹ کا ایک ایسا جال بنتے ہیں کہ پولیس اور عوام کو اس جھوٹ میں سچ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔بعض قاتل ایسے ادیبوں سے جیل میں ملتے رہتے ہیں جو ان کی سوانح عمریاں لکھتے ہیں۔

کنیڈا کے سیریل قاتل مائیکل میگرے Michael McGray نے تیرہ قتل کرنے کا اقرار کیا ہے لیکن پولیس کی رپورٹیں بتاتی ہیں کہ اس نے اصل میں صرف تین قتل کئے ہیں۔ کنیڈا میں جب بھی کوئی قتل ہوتا تھا اور وہ جیل سے باہر ہوتا تھا تو وہ مشہور ہونے کے لئے کود ہی اس قتل کا الزام اپنے سر لے لیتا تھا۔

جاوید اقبال نے بھی مشہور ہونے کے لئے کئی قتلوں کا الزام اپنے سر لے رکھا ہے۔

8۔مسیحائی کا خواب:

بہت سے سیریل قاتل مسیحا بننے کو خواب دیکھتے رہتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو خدا کا برگزیدہ انسان سمجھتے ہیں جو قوم کو سدھارنا چاہتا ہے اور اسے غلط راہ سے ہٹا کر سیدھے راستے پر لگانا چاہتا ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جو راستہ اختیار کرتے ہیں وہ تباہی اور بربادی کا ہوتا ہے۔

مارکس ایسکس Mark Essex اپنے آپ کو کالا مسیحا Black Messiah سمجھتا تھا ایسا مسیحا جو صلیب کی بجائے بندوق پسند کرتا تھا۔

A Messiah who carried a rifle, not a cross

سیریل قاتلوں کی زندگی ایسے تضادات سے پر ہوتی ہے۔ وہ باتیں نیکی کی لیکن اعمال بدی کے کرتے ہیں۔ وہ عوام کو نئی زندگی دینا چاہتے ہیں لیکن معصوم انسانوں کو قتل کرتے رہتے ہیں۔ وہ مسیحا بننے کا خواب دیکھتے دیکھتے قاتل بن جاتے ہیں۔

جاوید اقبال کا بھی ایمان تھا کہ بچپن میں باباجی نے اسے ایک ایسا برگزیدہ انسان قرار دیا تھا جو روحانی طاقتیں رکھتا تھا جن سے وہ نہ صرف بیماروں کا علاج کر سکتا تھا بلکہ پوری قوم کو سنوار بھی سکتا تھا۔ جاوید اقبال کا کہنا تھا کہ چونکہ پٹھان لڑکوں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کا دل توڑ دیا تھا اسی لئے پوری قوم پر عذاب آ گیا تھا۔ یہ وہی عذاب تھا جس کی پیشین گوئی باباجی نے اسکے بچپن میں کی تھی۔

==========

اکیسواں باب ... انسانیت کا تاریک رخ

سیریل قاتلوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں انسانیت کے تاریک رخ کو دیکھ رہا ہوں۔ان کے حالاتِ زندگی پڑھتے ہوئے میں اپنے آپ سے یہ سادہ مگر گھمبیر سوال پوچھ رہا تھا کہ انسان کی فطرت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے جہاں میں نے عوام سے تبادلہِ خیال کیا وہیں میں نے انسانی نفسیات اور عمرانیات کے ماہرین کی آرا کا مطالعہ بھی کیا۔

جن لوگوں سے میں نے تبادلہِ خیال کیا ان کو تین گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے گروہ کا خیال ہے کہ انسان فطرتاً بدکار اور گنہگار ہے۔ وہ سب کام اپنی خودغرضی کی وجہ سے کرتا ہے۔اس لئے اس کے لئے اپنے مقاصد کے لئے کسی کو قتل کرنا بھی بعید از قیاس نہیں۔ وہ لوگ جہاں قتل کو برا عمل سمجھتے ہیں وہیں اسے انسانی فطرت کا حصہ بھی مانتے ہیں۔

دوسرے گروہ کا ایمان ہے کہ انسان فطرتاً نیک اور ہمدرد ہے جو دوسروں کا خیال رکھتا ہے اور انہیں تکلیف نہیں پہنچاتا۔ان کا خیال ہے کہ جن لوگوں کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہوتی وہ غلط راستے پر نکل جاتے ہیں اور ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے ان کو خود بھی اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ان کا ایمان ہے کہ کوئی بھی بچہ قاتل پیدا نہیں ہوتا۔

تیسرے گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً نہ تو نیک ہے نہ بد۔ وہ کورے کاغذ کی طرح ہے۔اس کی پرورش جس ماحول میں کی جائے وہ اسی ماحول میں ڈھل جاتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ہر بچہ بہت سے امکانات لے کر پیدا ہوتا اور اس کی تربیت اسے مختلف سانچوں میں ڈھال دیتی ہے۔

جب میں نے ماہرین کی آرا کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ان کی کتابیں پڑھیں تو مجھے وہ

سات فلاسفر یاد آئے جو ایک تاریک کمرے میں ہاتھی تلاش کر رہے تھے اور ان کے ہاتھ ہاتھی کا جو حصہ آیا تھا انہوں نے اسی کو ہاتھی سمجھ لیا تھا۔ان کی ہاتھی کے بارے میں رائے ہاتھی سے زیادہ ان کے اپنے ذہنی افق کی عکاسی کرتی تھی۔

اس مطالعہ میں جس فلاسفر کا میں نے سب سے پہلے مطالعہ کیا وہ کونریڈ لورنز Konrad Lorenz تھا جو آسٹریا کا باشندہ تھا۔اس کا خیال تھا کہ تشدد انسانی فطرت کا حصہ ہے جو ہمیں حیوانوں سے وراثت میں ملا ہے۔اس کے نظریے کے مطابق انسانی جذبات میں حالات کے دباؤ سے حدت پیدا ہوتی رہتی ہے اور آخر میں ابال آ جاتا ہے۔لورنز کا خیال تھا کہ تشدد ہماری جبلت کا حصہ ہے جو ایک توانائی کی صورت میں ہماری ذات کا حصہ رہتا ہے اور ناسازگار حالات کی غیر موجودگی میں بھی ایک دریا کی طرح بہتا رہتا ہے۔

میری نگاہ میں لورنز کا نقطۂِ نظر نہایت میکانکی ہے۔میری نگاہ میں لورنز نے انسانوں کو بھی پرندوں اور جانوروں کی طرح سمجھنے کی کوشش کی۔اس نے یہ نہیں جانا کہ انسان کی فطرت میں ایک دوئیduality ہے۔اس میں فرشتہ اور شیطان بننے کے امکانات بیک وقت موجود ہیں۔یہی دوئی اس کے خمیر میں شامل ہے یہی اسے حیوانون سے متمیز کرتی ہے اور یہی اسے انسان بناتی ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا فلسفی سگمنڈ فرائڈSigmund Freud تھا جو تحلیلِ نفسی کا باوا آدم تھا۔اس کا خیال تھا کہ ہر انسان میں دو جبلتیں ہیں۔زندگی کی جبلت اور موت کی جبلت۔ فرائڈ تمام عمر انسانی اعمال کے نفسیاتی اور لاشعوری محرکات کو تلاش کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔اپنی تمام تر تحقیقات کے باوجود وہ انسانی تشدد کو اسکی جبلت کا حصہ سمجھتا رہا۔فرائڈ نے اپنی تحقیق اور ریاضت سے انسانی ذات کے کئی تاریک گوشوں کو اجاگر کیا۔اور انسانی لاشعور کی کئی بصیرتیں پیش کیں۔

میری نگاہ میں فرائڈ نے نفسیاتی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے باوجود انسانی زندگی کے کئی سماجی اور معاشرتی عوامل کو نظر انداز کیا جس کا اندازہ ماہرین کو اب ہو رہا ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا فلسفی بی ایف سکنر B.F.Skinner تھا جس نے انسانی اعمال کو ایک سائنسدان کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی۔ سکنر کی کتابیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ ماہرِ نفسیات کم اور ایک انجینئر زیادہ ہو۔ کیونکہ وہ انسانی اعمال کے ظاہر پر توجہ مرکوز کرتا ہے داخل پر نہیں۔ اس کا فلسفہ نہایت میکینیکل Mechanical ہے جو انسانی زندگی کا ایک مشین کی طرح تجزیہ کرتا ہے وہ انسانی جذبوں اور خوابوں کا زیادہ احترام نہیں کرتا۔

لورنز، فرائڈ اور سکنر کے فلسفوں کے پڑھنے کے بعد میں نے جن فلاسفروں کا مطالعہ کیا وہ ایرک فرام Eric Fromm، ابراہم میسلو Abraham Maslow اور رچرڈ بیوک Richard Bucke تھے۔ ان کے نظریات نے مجھ پر بصیرتوں کی نئی کھڑکیاں کھولیں۔

ایرک فرام کا کہنا ہے کہ انسانوں کی فطرت میں میں جارحیت اور تشدد کا عنصر دو طرح کا ہے۔ پہلی قسم کا تشدد، جسے فرام Benign Aggression کا نام دیتا ہے، وہ تشدد ہے جو بنیادی طور پر اپنی ذات اور زندگی کے دفاع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ انسانوں میں یہ تشدد اس جبلت کا حصہ ہے جو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہی جبلت جانوروں کو شکار کرنے میں مدد کرتی ہے تاکہ وہ زندہ رہ سکیں۔

دوسری طرح کا تشدد، جسے فرام Malignant Aggression کا نام دیتا ہے، وہ تشدد ہے جو صرف انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسی جارحیت رکھنے والے انسان ذہنی طور پر صحتمند نہیں ہوتے اور دوسروں کو دکھ اور تکلیف پہنچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس تشدد کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب ایسے انسان اجنبی بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ فرام کی نگاہ

میں ایسی جارحیت رکھنے والے انسان معاشرے کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں۔

ابراہم میسلو نے اپنا فلسفہ ۱۹۷۰ مین اپنی کتاب Motivation and personality مین پیش کیا جس نے انسانی نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ میسلو کا کہنا ہے کہ مختلف لوگ مختلف کام مختلف نفسیاتی وجوہات کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اس نے ان وجوہات اور جذبوں کی ارتقائی منازل کی طرف اشارے کیۓ۔ میسلو کا خیال تھا کہ بعض لوگ تمام عمر اپنی بنیادی ضروریات کی تسکین میں گزار دیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی کا ایک مقصد اور ایک آدرش ہوتا ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں ارتقا کی اگلی منزل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ میسلو نے انسانی شخصیت کو ایک نئے انداز سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔

جس طرح میسلو نے انسان کے نفسیاتی ارتقا پر توجہ مرکوز کی اسی طرح بیوک نے اپنی کتاب Cosmic Consciousness میں انسانیت کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا۔ بیوک نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کرہِ ارض پر زندگی اور شعور نے ارتقا کے تین مراحل طے کیۓ ہیں۔

پہلا مرحلہ سادہ شعور Simple Consciousness کا ہے۔ اس سطح پر پرندے، مچھلیاں اور جانور زندگی گزارتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ ذات کا شعور Self Consciousness کا ہے جو انسانوں میں پایا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے انسان نے مختلف زبانوں اور مذاہب کو جنم دیا ہے۔

تیسرا مرحلہ آفاقی شعور Cosmic Consciousness کا ہے۔ بیوک کا خیال ہے کہ انسانی تاریخ میں صرف چند لوگ ایسے تھے جنھیں آفاقی شعور حاصل ہے جن میں بدھا، عیسیٰ اور والٹ وٹمین Walt Whitman جیسے شاعر، ادیب، پیغمبر اور فلسفی شامل ہیں۔

بیوک کا خیال ہے کہ انسانی ارتقا کا عمل اتنا سست ہے کہ ارتقا کے ہر قدم کو ہزاروں سال لگ جاتے ہیں۔ جس طرح سادہ شعور سے ذات کے شعور تک پہنچنے میں صدیاں بیت گئیں اسی طرح ذات کے شعور سے آفاقی شعور تک پہنچنے میں بھی ہزاروں سال لگ جائیں گے اور وہی شعور جو ہر صدی میں صرف چند لوگوں نے حاصل کیا ہے وہی شعور آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ لوگ حاصل کرنے لگیں گے۔

بیوک نے اپنی تخلیقات میں لکھا ہے کہ انسانی شعور کے سفر کا ایک پڑاؤ اخلاقی شعور Moral Sense ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جسطرح کئی لوگ پیدائشی طور پر رنگوں کی تمیز نہیں کر سکتے اور Colour Sense نہ ہونے کی وجہ سے Colour Blind کہلاتے ہیں اسی طرح بعض لوگ Moral Sense نہ ہونے کی وجہ سے Morally Blind ہوتے ہیں اور سائیکو پیتھ Psychopath کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ضمیر مردہ ہوتے ہیں اور ان کے دل دوسروں کے لئے ہمدردی کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتے۔

بیوک کے نقطۂ نظر کے مطابق جن لوگوں کے ضمیر مردہ ہوتے ہیں اور وہ اخلاقی شعور سے بیگانہ ہوتے ہیں ایسے لوگ جوان ہو کر دوسروں کا قتل کرنے سے باز نہیں آتے اور ان کے ضمیر بالکل کچوکے نہیں لگاتے۔

بیوک کو یقین تھا کہ جوں جوں انسانی ارتقا کا سفر آگے بڑھے گا زیادہ سے زیادہ لوگوں میں آفاقی شعور پیدا ہوگا اور انسانی معاشروں میں چوروں، ڈاکوؤں، ظالموں اور قاتلوں کی تعداد کم اور شاعروں، صوفیوں، ادیبوں اور فلاسفروں کی تعداد بڑھے گی۔ جب ہم ایسے ماحول میں زندہ رہیں گے تو امن اور آشتی کی زندگی گزار سکیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کرۂ ارض پر انسان اس وقت تک زندہ رہیں گے یا انسان اجتماعی خودکشی یا قتل سے ساری انسانیت کو کرۂ ارض سے

وقت سے پہلے ہی نیست ونابود کردیں گے۔

==========

بائیسواں باب ... جاوید اقبال کی ڈائری

میں فتح گڑھ میں بہت خوش وخرم رہتا تھا۔ دو دکانیں ویڈیو گیم سے روزانہ پانچ سے سات سو روپے خرچہ آ رہا تھا۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نسیم صاحب اور یٰسین نے بہت ساتھ دیا تھا۔ نسیم صاحب کا ساتھ پچھلے بیس سال سے معمول تھا۔ ہر چھٹی کے روز وہ سارا دن میرے ساتھ گزارتے تھے۔ بابا یٰسین بھی میرے ساتھ تھا۔ ظفر اور ساجد کے علاوہ ملازم بھی تھے۔ زندگی خوشگوار گزر رہی تھی۔ میں نے مکان فروخت کر کے رہائش تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ یہاں کے لوگ بہت مطلب پرست اور غیر معقول ثابت ہو رہے تھے۔

15 ستمبر 1998ء کو میں یادگار (مینار پاکستان) سیر کے لئے ملازم ارباب کے ساتھ گیا کیونکہ ظفر کو میں نے وقتی طور پر چھٹی دے دی تھی۔ ساجد بھی چھٹی پر تھا۔ صرف دو نئے لڑکے تھے۔ عبدالرحمٰن بھی بغیر اطلاع چھٹی کر گیا۔ اب صرف ارباب ہی تھا۔ عبدالرحمٰن کا پتہ کیا مگر نہ ملا۔ میں نے یادگار (مینار پاکستان) پر ایک اٹھارہ بیس سال کا کالا سا لڑکا دیکھا۔ کام کے بارے پوچھا تو وہ راضی ہو گیا اور ساتھ آ گیا۔ دو موریہ پل سے گزرا تو ایک اور نوجوان ملا۔ اسے بھی کام کا پوچھا تو ساتھ آ گیا۔ پہلا نارووال کا تھا، دوسرا کوہاٹ کا تھا۔ 17 ستمبر اور 20 ستمبر کے لئے اخبار میں اشتہار لگائے۔ 17 ستمبر کو بہت لوگ مکان دیکھنے آئے۔ مکان کا سودا ایک میجر سے ہو گیا۔ میجر نے کہا کہ دو لاکھ دو دن میں دوں گا اور باقی تین لاکھ چالیس ہزار پندرہ سے بیس دن میں دوں گا، میں راضی ہو گیا۔ مکان کے نیچے میرے تین ملازمین یٰسین اور دو نئے ملازم موجود تھے۔ میجر نے جاتے ہوئے کہا کہ دو لاکھ کے بعد باقی رقم کا فکر نہ کرنا، مکان اب میرا ہو گیا۔ میں نے ہاں کہا اور وہ چلا گیا۔ ملازم اور یٰسین نے پوچھا کہ سودا ہو گیا۔ میں نے ہاں کہا اور اوپر چلا گیا۔ اسی رات کمرے میں میں بیڈ پر سویا، تین فوم کے گدے تھے وہاں ارباب اور دونوں نئے

ملازم تھے۔ کمرے کی چابی میرے گدے کے نیچے تھی۔ میں نے سوتے وقت اے۔سی بند کر دیا تھا۔ صبح میں جلدی اٹھا تھا اس لئے کہ رات جلدی سو گیا تھا۔ تقریباً 8 اکتوبر کو مجھے ہوش آئی تو والدہ کے گھر تھا۔ میں بہت تکلیف میں تھا۔ والدہ نے بتایا کہ تم بیمار ہو، تمہارے ساتھ حادثہ ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ مجھے 17 ستمبر کی رات قتل کر دیا گیا، ہمراہ چھوٹا بچہ ارباب بھی قتل کیا گیا تھا۔ میں جنرل ہسپتال میں بائیس روز بیہوش رہا ہوں۔ میرا قتل میرے گھر فتح گڑھ میں سوتے ہوئے کیا گیا وقوعہ کے مطابق صبح سویرے نماز کے وقت ارباب کی چیخیں محلہ داروں کو سنیں تو انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو بنوں کوہاٹ والے ملازم جو صبح سویرے نہار رہا تھا، نے دروازہ کھولا۔ محلے داروں نے پوچھا کہ بچہ کیوں چیخ رہا ہے تو وہ انہیں لے کر اوپر گیا اور محلے داروں نے میرا حال دیکھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ میں بیہوش تڑپ رہا تھا۔ منہ پر چوٹیں لگائی گئی تھیں۔ میرا منہ بری طرح سوجا ہوا زخمی تھا۔ محلے داروں نے پولیس کو اطلاع کی، مجھے ہسپتال بھجوایا۔ پٹھان بنوں کوہاٹ والے نے بیان دیا کہ رات کو مالک کے مہمان آئے تھے جو مار گئے۔ پھر بیان دیا کہ میں نیچے سو گیا تھا۔ مگر یہ جھوٹی کہانیاں تھیں۔ پھر بیان دیا کہ مالش کے لئے مالک نے آدمی بلایا تھا وہ مار گیا۔ یہ بھی سراسر جھوٹ تھا۔ میں نے کبھی مالش نہیں کروائی۔ کمرے کے اندر میں نے تین ملازم سلائے، چابی میرے گدے کے نیچے تھی، میں ہمیشہ تالا بند کر کے سوتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ رات کو کسی پٹھان اور نارووال والے نے ارباب کے ساتھ بدفعلی کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران ارباب نے' جو دس سال کا بچہ تھا، شور مچایا۔ اس کو دماغ پر چوٹ ماردی۔ میں نے سوتے ہوئے ہلنے کی کوشش کی تو مجھے بھی میرے سرہانے موجود رائفل کے بٹ مار کر بیہوش کر دیا۔ بچے کے ساتھ بدفعلی کرنے کے بعد دونوں نے گھر کی تلاشی لی۔ میرے گدے کے نیچے سے چابیاں نکال کر لیں۔ میرے سیف کے اندر موجود آٹھ ہزار نکالے اور دو لاکھ کو ڈھونڈتے رہے۔ پھر خون آلود کپڑے دھوتے رہے۔ اس دوران ارباب کو ہوش آ گئی اور اس کے چیخنے پر محلے دار آ گئے۔

جب بنوں کوہاٹ والا محلّہ داروں کو لے کر اوپر آیا تو ناروووال والا بھاگ گیا کیونکہ وہ بھی نیچے چھپا ہوا تھا۔ دونوں نیچے نہا رہے تھے۔ محلّہ داروں اور پولیس نے بنوں کوہاٹ والے کو آٹھ ہزار روپے سمیت گرفتار کرلیا۔ تھانہ میں میں جب تک بیہوش رہا پٹھان گرفتار رہا مگر تھانہ کے رنگین مزاج ایس۔ایچ۔او کو جو داڑھی والا تھا، پٹھان بہت پسند آ گیا۔ ایس۔ایچ۔او نے اسے ذاتی کام کے لئے رکھ لیا اور اپنی رہائش گاہ میں لے گیا جہاں وہ اب تک ایس۔ایچ۔او کے ساتھ رہتا ہے۔ایس۔ایچ۔او نے اصل قاتل کو ایسے تحفظ فراہم کر دیا۔ میرے کیس کو پولیس نے درہم برہم کر دیا۔ میری بیہوشی کے دوران میرے بھائیوں کو کہا کہ ارباب کے ساتھ بدفعلی تمہارے بھائی نے کی ہے۔اس پر میرے بھائی بہنوں نے پچاس ہزار روپے تفتیشی کو دیئے جس نے دس ہزار روپے دے کر ارباب کے والدین کو گاؤں واپس بھجوا دیا۔ ارباب کو دس روز بعد ہسپتال میں ہوش آئی تھی ۔ وہ بھی دس روز بیہوش رہا تھا۔ پولیس کے اس رویہ پر میں نے خون کے آنسو بہائے۔ یہ وہی پولیس تھی جس کے ساتھ میں نے پچھلے بارہ سال تک اخباروں میں کام کیا تھا۔ پولیس افسروں کے میرے گھر سے درجنوں ماؤنٹ ملے تھے جو ڈی۔ایس۔پی سے آئی۔جی تک کے افسروں کے ساتھ میری تصویروں پر مبنی تھے مگر تھانہ کے افسروں نے کوئی توجہ نہ دی۔ سارا کیس درہم برہم کر دیا۔ مجھے مرنے کے بعد بدنامی دے دی۔ خدا نے بائیس روز بعد مجھے دوبارہ زندہ کر دیا۔ میں نے اپنا گھر فروخت کر دیا، گاڑی فروخت کر دی، گھر کا سارا سامان قیمتی فروخت کر دیا۔ اپنے چار آپریشن کروائے اور مہینوں ہسپتال میں رہا۔ میری ماں میرے ساتھ رہی۔ بیمار ماں دن رات میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ جب میں نے مکان فروخت کر دیا تو یادگار (مینار پاکستان) کے نزدیک قلعہ لچھمن سنگھ کے نزدیک راوی روڈ کے نزدیک گھر لے لیا۔

جب مجھے وہاں رہتے ہوئے پندرہ بیس دن ہوئے تھے تو امی نے میرے پالتو ملازم اقبال سے میری بہن نمی کی شادی کر دی کیونکہ امی کی حالت رات دن میری دیکھ بھال سے خراب ہو چکی

تھی۔امی کو اپنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں رہا تھا۔شادی کا پتہ کر کے میرے دوست بھی مجھے ملنے آئے جن میں نسیم صاحب پریم گلی سے تھے جن کو میں پچھلے بیس سال سے مرشد کہتا تھا۔ ہماری دوستی لازوال تھی اور بیس سال سے ہم اکٹھے تھے۔وہ ہر جمعہ اور اتوار کے روز صبح نو بجے سے رات آٹھ بجے تک ہمیشہ میرے ساتھ تھے۔مرشد نے جب میری حالت دیکھی تو بہت دکھ کیا اور بتایا کہ پولیس نے تمہارے حادثہ یا قتل میں تمہارے ہی دوستوں یٰسین وغیرہ کو گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے نسیم منظر سے غائب رہا تھا۔اب بھی وہ ڈر رہا تھا کہ پولیس تنگ نہ کرے۔ میں دن بدن ڈاؤن ہی ہو رہا تھا اس کے باوجود کہ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے میرے آپریشن کئے تھے ۔میری حالت بدستور خراب رہی اور میں چلنے پھرنے سے بھی قاصر ہو گیا۔لاکھوں روپے میری صحت کے لئے صرف ہو چکے تھے مگر صحت یابی بہت دور نظر آ رہی تھی۔ میں نے مرشد نسیم کو کہا کہ میرے پاس جو ڈھائی تین لاکھ بچے ہیں انہیں کاروبار میں لگا کر میرا خرچہ بھی چلا دو مگر مرشد نہ مانا کیونکہ کسی وقت بھی مجھے کاروبار سے رقم لے کر کسی آپریشن کے لئے ضرورت ہو سکتی تھی۔اس لئے مرشد نے میری رقم کاروبار میں نہیں پھنسائی۔ایک روز نسیم آیا تو میں نے کہا کہ مرشد میں جینا نہیں چاہتا۔ مجھے میرا قاتل یادگار (مینار پاکستان) سے مل سکتا ہے کیونکہ میں کام کے لئے یادگار (مینار پاکستان) ہی سے اسے لے کر آیا تھا، ہو سکتا ہے مل جائے۔مرشد نے کہا کہ تم نے ساری زندگی ملازموں کے ساتھ گزار دی ہے مگر یہ تمہارے نہیں بن سکے۔اگر تم زندگی نہیں چاہتے تو ان کو بھی زندگی سے نجات دو اور اگر ایسا کوئی وقت آ جائے کہ تم اپنی زندگی جاتی دیکھو تو کسی طرح سے ان لوگوں کو بھی مکا دو جنہوں نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ یہ بات میری سمجھ سے چپک کر رہ گئی۔ مجھے مرشد کی یہ بات بہت اچھی لگی کیونکہ موت میرا پیچھا کر رہی تھی اور کسی وقت بھی میرا خاتمہ تھا۔میں نے مرشد کی اس بات کو بہت سراہا اور مرشد سے کہا کہ کوئی راستہ ایسا بتاؤ کہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ ختم کر کے مروں کیونکہ مجھے بے گناہ کو موت دی گئی ہے اور اذیت

ناک زندگی میرا مقدر بنا دی گئی ہے میں اکیلا موت کے منہ میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری موت کا مول پڑے اور لوگوں کو جن لوگوں نے مجھے موت دی ہے وہ بھی میرے ساتھ چلیں۔ مرشد نے اور میں نے بہت سوچا مگر کوئی ایسا راستہ نہ مل سکا کہ میں آسانی سے بہت سارے قتل کرسکوں۔ ایسے ہی کافی دن سوچتے ہوئے گزر گئے۔ ایک دن مرشد نے میرا مسئلہ حل کر دیا اور بتایا کہ کیمیکل کے ذریعے لاشوں کو گٹر میں بہایا جا سکتا ہے۔ طے ہوا کہ ڈرم پلاسٹک کے لئے جائیں۔ کیمیکل کے کین (بڑی بوتلیں) لیں اور یادگار (مینار پاکستان) سے ایسے لوگ لائے جائیں جو پردیسی ہوں اور کاروبار یا کسی بھی بہانہ سے لا کر انہیں موت کی نیند سلا دیا جائے۔ پھر ان کی لاشوں کو ڈرم میں ڈال کر نمک کا تیزاب ڈال دیا جائے۔ ایک رات میں لاش پگھل جائے گی اور اسے گٹر میں بہادیں گے۔ مگر اس میں مشکل یہ آئی کہ تیزاب کون خریدے گا اور کون بہائے گا؟ لہٰذا میں نے اپنے ملازم صابر حسین کو جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی، اعتبار میں لیا اور اسے بتایا کہ میں ایسا کرنا چاہتا ہوں میرا ساتھ دو، وہ مان گیا۔ مرشد بھی کام میں مصروف ہو گئے تھے اور زیادہ ٹائم شہر سے باہر ہی رہتے تھے۔ اب کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ پہلے کی بجائے اب پندرہ بیس دن بعد آتے تھے۔ مگر میں
ان کے بتائے ہوئے راستے کو بہت پسند کرتا تھا اور ہمیشہ کی طرح بہت شکر گزار تھا۔

میں نے اپنے کام کی ابتداء 19 جون سے کی۔ اب باقی حالات ڈائری میں تاریخ کے حساب سے کروں گا۔ مرشد نہیں چاہتا تھا کہ ملازموں کو بھی اس کا پتہ چلے لہٰذا ان کے آنے اور ملنے کو میں ملازموں سے بھی چھپاتا تھا۔ جب ان کی ضرورت ہوتی میں بازار سے فون کر کے بلا لیتا تھا اور ایسے وقت میں ملازموں اور لڑکوں کو یادگار میں سیر کے لئے بھجوا دیتا۔ یوں وقت گزرنے لگا۔ اپنے کام کے لئے میں نے مختلف وقت پر مختلف آدمیوں کو استعمال کیا کیونکہ میں ایسی حالت میں تھا کہ بغیر سہارے پیشاب کے لئے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لوگوں کو قتل کرنا پھر لاشوں کو ڈرم میں

ڈالنا، پھر تیزاب کے کین میں ڈالنا، پھر تیزاب کو بالٹیوں میں نکالنا، پھر اسے بہا کر پانی کی بالٹیاں بہانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بازار سے روزانہ تیزاب خریدنا، گھر میں لانا، یہ سب کے لئے میں نے مختلف لوگ استعمال کئے۔ان کو یہ نہیں بتایا کہ تیزاب کس لئے لاتے ہیں۔گھر میں موجود لوگوں کو کہا کہ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ کیمیکل کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ وہ آتے ہیں اور بوتل یا کین لے جاتے ہیں اور ہم بازار سے خرید کر تیزاب یہاں رکھ لیتے ہیں۔

کمرے میں تیزاب کے کین رکھ کر ہمیشہ بند رکھتا تھا اور لڑکوں کو ڈرم سے پرے رکھتا تھا۔'

(جاوید اقبال کی ڈائری کے باقی ماندہ حصے جس میں اس سو قتلوں سے قبل اس کی زندگی کے روزمرہ کے حالات لکھے ہیں۔)

12 فروری: امی کی طبیعت مسلسل خراب رہتی ہے اس لئے میں نے امی کو کہہ دیا ہے کہ ننھی کے گھر رہیں میرے گھر میں میں ٹھیک ہوں فکر نہ کریں۔امی مان گئیں اور گھر چلی گئی ہیں۔ میرے پاس صابر اور ساجد ہیں، گزارا ہو رہا ہے۔میرے کھانے پینے کا صابر بہت خیال رکھتا ہے

20 فروری: آج فتح گڑھ والا مکان فروخت کر دیا۔سامان اقبال اور اس کے چھوٹے تین بھائیوں نے لوڈ کروا کر راوی روڈ بھجوایا۔راوی روڈ میں آج پہلے روز سوئے۔امی میرے ساتھ ہیں۔

22 فروری: ڈاکٹر یعقوب بیگ کے پاس گئے، چیک اپ کروایا۔ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔

24 فروری: آج اقبال، امی اور میں ملازم صابر حسین کے ساتھ گلبرگ ہسپتال آپریشن کے لئے چلے گئے۔

25 فروری: آج آپریشن ہو گیا۔صبح 9 بجے سے شام 5 بجے تک بہت دوست اور رشتہ دار آئے ۔ساتھ شام کو میری بیٹی سروش اور بیوی نازلی بھی سارے گھر والوں کے ساتھ آئے۔سروش نے ڈھیر سارے پھول تحفہ دیئے۔

9 مارچ: آج میاں جی کے روضہ پر میں پڑھائی کرنے چلا گیا۔ امی، شہزاد اور ساجد بھی ہمراہ رہے۔ میں نے ساری رات تسبیح کی اور اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے دعائیں کیں۔ امی نے بھی پڑھائی کی۔ اب ہم کافی روز روضہ پر ہی رہیں گے۔

15 مارچ: روضہ پر عبادت کی، آج ہم راوی روڈ چلے جائیں گے۔ میری طبیعت وہاں مسلسل رہنے سے بہت خراب ہوگئی ہے۔

16 مارچ: کل رات دیگ چڑھا کر روضہ سے رخصت ہوگیا تھا۔ امی ننھی کے پاس چلی گئیں۔ دونوں لڑکے شہزاد اور ساجد بھی میرے ساتھ واپس آ گئے ہیں۔

18 مارچ: آج مرشد نسیم صاحب آئے، تھوڑی دیر رہے پھر چلے گئے۔

22 مارچ: آج نعیم، ساجد کو باہر ملا۔ ساجد ساتھ لے آیا۔ میں نے رکھ لیا۔ اسے کپڑے دیئے۔ نعیم تاجپورہ سکیم کی کوٹھی میں دو ماہ ہمارے پاس گھر کا کام کرتا تھا۔ آج کئی ماہ بعد ملا ہے۔ میری حالت دیکھ کر اس نے بھی افسوس کیا ہے۔

23 مارچ: نعیم کے ساتھ داتا دربار جا کر عبادت کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ انشاءاللہ چند روز بعد جا کر عبادت کا معمول بنانا ہے۔

26 مارچ: اظہر کام پر واپس آ گیا۔ اب صابر، ساجد اور نعیم کے ساتھ ہی رہے گا۔ اظہر شاد باغ میں رہتا ہے۔

27 مارچ: آج نعیم کے ساتھ اور شہزاد کے ساتھ داتا دربار میں رہے۔ ساری رات دربار پر عبادت اور تسبیح کرتا رہا۔

29 مارچ: دربار رات رہے۔ شہزاد اور نعیم میرے ساتھ رہے۔

30 مارچ: دربار داتا گئے، رات گزاری عبادت کی۔

31 مارچ: بابا یٰسین میری خبر لینے آیا۔ اس کا بھی ہرنیا کا آپریشن دوبارہ ہونا ہے۔ میں نے یقین

دلا دیا ہے کہ میں سارا خرچہ بھروں گا۔ وہ بہت خوش ہوا۔

یکم اپریل: داتا دربار جانا معمول بنالیا۔ آج بھی گئے، رات بھر عبادت کی۔

2 مئی: آج نسیم صاحب آئے، منصوبہ پر بہت غور وفکر کیا۔ ہر طرح سے منصوبہ کو درست قرار دیا ۔3 بجے کے بعد بابا یٹین بھی آ گیا۔ اسے بھی نسیم صاحب نے میرا ساتھ دینے کا کہا تو وہ مان گیا۔

3 مئی: آج ظفر آیا۔ میں نے اسے باتوں باتوں میں بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے انتقام لوں اور مجھے بے گناہ کو قتل کرنے والوں کو بھی میں بے گناہ حالت میں قتل کروں۔ ظفر نے میرے منصوبہ سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ میرا حق ہے۔ کہا کہ وہ میرے ساتھ ہر تعاون کرے گا۔ میرا دل بہت خوش ہوا اور حوصلہ بڑھ گیا۔

7 مئی: آج ظفر کو کام پر رکھا 2500 روپے ماہوار۔ اپنے منصوبہ سے اسے آگاہ کیا تھا۔ اس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، آج آ گیا ہے۔ منصوبہ بنا کہ کاروبار شروع کرتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لڑکے یادگار سے آسکیں اور نمکو، پاپڑ، سویاں اور مکئی کے پھلے کا کاروبار کے لئے ظفر کو 5000 روپے دیئے، وہ سامان لے آیا۔

7 مئی: آج فتح گڑھ سے میرے گھرے دوست مولوی ریاض، عاشق حسین، بھٹی صاحب آئے۔ میری خیر خیریت پوچھی۔ ان کے آنے پر بہت خوشی ہوئی۔ یہ تینوں فتح گڑھ میں میرے ہمدرد دوست تھے۔ ہر موقع پر میری مدد کی۔ میں نے بھی گاہے بگاہے ہر موقع پر ان کے ساتھ تعاون کیا۔ عاشق حسین کو فریج دی، صوفہ دیا، کرسیاں دیں، فولڈنگ پلنگ اور درجنوں چیزیں ادھار دیتا رہا۔ وہ بھی ہر موقع پر محبت اور چاہت کا اظہار کرتا رہا۔

9 جون: آج ساجد کو ظفر اور صابر نے گھر جا کر اس کی والدہ سے مل کر لانے کی کوشش کی۔ ساجد گھر میں تھا مگر ماں نے جھوٹ بولا کہ نہیں ہے۔ صابر نے ظفر کا صبح چھ بجے سے آٹھ بجے تک

انتظار کیا۔ساجد گھر سے کسی کام کے لئے نکلا تو اسے ملے۔ساجد 29000 ہزار روپے اٹھا کر بھاگا تھا مگر اسے کہا کہ بھائی جان نے معاف کر دیا لہٰذا وہ آج 9 جون بدھ کو آ گیا۔ میں نے معاف کر دیا۔ وہ ظفر کے ساتھ گھر کا کام کرتا رہا۔ظفر نے کھانے کا سامان پیک کر کے بیچنے کا کام شروع کیا ہے۔ وہ ساتھ کام کرتا رہا۔ظفر نے کہا کہ میری ماں نے 5000 روپے ہوٹل والوں سے لیا ہے اور مجھے یہاں کام کرنے نہیں دیتی۔ میں نے کہا جو بہتر کرنا ہے کرو۔اس نے چھٹی کر لی اور اب یہاں ساجد اور صابر ہیں۔ساتھ چھ وہ لڑکے ہیں جن کے ساتھ ظفر کاروبار کرتا تھا، دو ہمارے لڑکے ہیں۔

13 جون: آج ناصر شیخ صاحب آئے۔انہیں نسیم صاحب نے پتہ دیا تھا۔میری حالت پر بہت افسوس کیا۔ میں نے بتایا کہ نسیم صاحب اور میں دنیا کو ختم کرنے کے منصوبے پر ہیں۔ ناصر صاحب نے ساری عمر میرے ساتھ بہت مہربانیاں کیں، یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہی ہونا چاہیئے۔

14 جون: کل میں نے ناصر کو بھی کہا تھا کہ رام گلی نمبر 3 میں اپنی دکان ذیشان پائپ سٹور پر میرا کچھ سرمایہ لگا لیں تو ناصر صاحب نے کہا کہ ابھی بھائیوں کے ساتھ ان کا حساب کتاب چل رہا ہے۔اس کے بعد چند روز تک کچھ کریں گے۔

15 جون: ظفر چھٹی کرنے کے باوجود ہر روز صبح پانچ بجے سے ساڑھے تین بجے تک یہاں آتا ہے، یہاں سوتا ہے، یہاں کھاتا ہے۔چھٹی اس نے اپنی والدہ کی وجہ سے کی ہے مگر ہمیں نہیں چھوڑا۔اس کی اس محبت سے بہت خوش ہوا اور اسے خرچہ دیتا رہتا ہوں۔

16 جون: میرے سالے گوشی، ندیم اور عظیم قریشی آج میری خبر لینے آئے۔ پھل اور مٹھائی ساتھ میری بیٹی کی بھیجی ہوئی پھولوں کی شاخ مجھے دی۔ میں بہت خوش ہوا۔تھوڑی دیر رہ کر چلے گئے۔

17 جون: آج نسیم صاحب آئے۔ مجھ سے لئے گئے مبلغ دس ہزار روپے میں سے پانچ ہزار روپے آج واپس دے گئے ہیں۔

19 جون: آج بینک سے اپنے انعامی چیک میں سے ایک چیک دس ہزار کیش کروائے۔ دو ڈرم خریدے۔ آٹھ کین تیزاب خریدا۔ لڑکوں کو بتایا کہ ایک دوست کا کارخانہ رانا ٹاؤن میں ہے سریا تیزاب کر کے پتلا کرتے ہیں۔ کاروبار میں میں نے بھی روپیہ لگا دیا ہے۔

20 جون: آج نسیم صاحب آ گئے۔ یادگار گئے اور ایک پندرہ سالہ لڑکا، اس کا نام یاسر تھا اور حافظ آباد کا تھا، اسے لے آئے۔ لڑکوں کو بہانے سے بھیج دیا اور یاسر کو نیند کی چار گولیاں دے دیں اور سوتے حالت میں گندھک کے تیزاب کو بوتل میں ڈال کر اس میں سائینا فائٹ ڈال دی اور ربڑ کی نالی لگا دی۔ ربڑ پائپ کے ساتھ ماسک گیس لگا دی اور یاسر کے منہ پر گیس ماسک لگائی۔ وہ چند سانس لے کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ آج پہلے دن گیس کا تجربہ کیا۔ یہ نسیم صاحب کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے کسی تیزاب والے سے یہ حاصل کیا تھا جو سو فیصد کامیاب رہا۔ لڑکا سفید گیس میں چند سانس لے کر ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کی لاش کو میں نے اور صابر نے اٹھا کر ڈرم میں رکھا۔ مرشد اور صابر نے دو کین نمک تیزاب ڈال دیا اور ڈھکن کو بند کر دیا۔ یہ ہمارا پہلا قتل تھا۔ شام تک نسیم صاحب یہاں رہے۔ دو تین بار دیکھا لاش کیسی سڑ رہی تھی مگر تیزاب کی وجہ سے کوئی بو نہیں آ رہی تھی۔ اگلی شام بھی نسیم صاحب آئے۔ لڑکوں کو یادگار بھجوا کر لاش کو دیکھا تو لاش تیزاب میں حل ہو چکی تھی۔ چند پیس تھے انہیں رکھ کر بالٹی میں سارا تیزاب مزید ڈال دیا۔ صبح تک سب ختم ہو گیا۔ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ تجربہ کامیاب ہونے کے بعد آج پھر نسیم صاحب آ گئے اور ہم نے دوبار کوئی مناسب لڑکا ڈھونڈا مگر نسیم صاحب چاہتے تھے کہ کوئی پٹھان ملے مگر وہ آج نہ مل سکا۔ وہ واپس آ گئے۔ آج کوئی کام نہ ہو سکا۔ شام کو نسیم صاحب چلے گئے۔ ہم تجربہ کامیاب ہونے سے بہت خوش تھے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں بے گناہ قتل ہوا تھا۔

پولیس اور کسی بھی واقف نے میری کوئی مدد نہیں کی تھی۔ محلّہ داروں نے پولیس کے ساتھ مل کر مجھے بدنام کیا تھا اب میں اپنے قتل کا خود انتقام لے سکوں گا اگر میں دنیا میں نہیں رہوں گا تو نجانے کتنے لوگ زندگی ہار جائیں گے۔

24 جون: آج میری خیر خیریت لینے فتح گڑھ سے مولوی ریاض آئے جو میرے بہت دوست ہیں اور ساتھ عاشق حسین جن کی بدولت میں قتل والے دن بچا۔ ارباب میرے ملازم کو عاشق نے ہسپتال پہنچایا اور وہاں ساتھ رکھ کر کئی دن تک میرا ساتھ دیا اور ان کے میرے اوپر بہت احسانات تھے۔ ان دونوں نے میری خیریت بھی کی۔ میں نے ساری بات سنا دی اور ڈرموں میں موجود لاش بھی دکھائی اور بتایا کہ مرشد نسیم میرے ساتھ ہیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

25 جون: آج میں نے بہت بڑی غلطی کی۔ نیو شادباغ میں بہنوئی حاجی شاہد جو میرا بچپن سے آج تک گہرا دوست اور ماموں کا بیٹا بھی ہے سے اپنے مشن کے بارے مکمل بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ کیسے ہم نے اب تک قتل کئے مگر بعد میں میں نے دل میں افسوس کیا کہ مجھے زبان بند رکھنی ہوگی۔ اس طرح میرا مقصد پورا ہونے سے پہلے ہی سب طرف میرا چرچا ہو جائے گا۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا دل میں تہیہ کر لیا

26 جون: میوہ منڈی سے ظفر اقبال کو ایک پٹھان لڑکا ملا۔ پندرہ سال، رنگ گورا، پشاور کے کسی گاؤں کا لڑکا تھا۔ جلدی میں لڑکوں کو باہر بھیجا اور ظفر نے پانچ نیند کی گولیاں جوس کے ساتھ دیں اور نیند آنے پر ماسک کے ذریعے گیس دی، فوراً مر گیا۔ ڈرم نمبر دو میں ڈال کر دو کین نمک تیزاب ڈال دیا۔ ظفر کو انعام میں پانچ سو روپے میں نے دیئے اور دوسرا قتل بھی بخوبی ہوا۔ ظفر کے ساتھ صابر نے کام کیا۔

27 جون: اتوار کو مرشد یا کوئی بھی نہ آیا۔

28 جون: آج شیخ ناصر صاحب آئے۔ انہیں ڈرم دکھائے۔ ابھی لاشیں موجود تھیں۔ انہیں بتایا کہ ایک رات میں سب ختم ہو جاتا ہے اور میں اب یہی کرنے والا ہوں۔ تفصیلات بتائیں بہت خوش ہوئے، مجھے حوصلہ دیا اور بہت باتیں حوصلہ کی کیں۔ ناصر صاحب بھی کچھ آدمی مروانا چاہتے تھے۔ میں مان گیا۔ ناصر صاحب نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ میرے سامنے بھی قتل کر کے دکھائیں۔ میں نے کہا کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے ختم کریں۔ وہ خوش ہو گئے اور چلے گئے۔

29 جون: ہمارا لاڈلا لڑکا نعیم، عمر چودہ سال، بہت خوبصورت تھا۔ تین ماہ پہلے یہاں آیا مگر راتوں کو اکثر غائب ہو جاتا تھا۔ میں اس سے بہت تنگ تھا۔ چالاک تھا۔ مجھے شک ہوا کہ اسے ہماری کاروائیوں کا شک ہو گیا ہے۔ مرشد نسیم کو آج بلایا، مشورہ کیا۔ انہوں نے فوری طور پر اسے ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ بہت افسوس کے ساتھ میں نے اجازت دے دی اور پھر آج رات سات بجے نو عدد نیند کی گولیاں دے کر اور گیس دے کر ختم کیا۔ مرشد نے ساتھ دیا۔ تیسرا قتل بھی مکمل ہوا۔ میں رات گئے تک اسے یاد کر کے دل میں روتا رہا۔ بار بار ڈرم میں اس کی ختم ہوتی لاش کو دیکھتا رہا۔ نعیم کا ایڈریس جو میرے پاس تھا 74 چک، مکان نمبر 40، محلّہ ماچھی پورہ، چیچہ وطنی۔

میرے قتل والے منصوبہ میں نسیم، ظفر اور صابر میرے ساتھ بہت کام کر رہے ہیں مگر یٰسین مغل پورہ سے نہیں آ رہا، شاید وہ بھی بیمار ہے۔ اس کا ہرنیا کا آپریشن ہونا ہے۔ منصوبہ کے بارے میں نسیم صاحب نے اسے آگاہ کر دیا تھا اور اس نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

یکم جولائی: آج مرشد نہیں آئے، صابر اکیلا تھا، یادگار سے اٹھارہ سالہ خانیوال کا لڑکا لایا۔ اسے ملک شیک میں چھ نیند آور، والیم دس گولیاں دیں۔ سونے پر ماسک لگایا۔ گیس میں چھ سات سانس لینے پر بے حس ہو گیا۔ آنکھیں الٹ گئیں۔ صابر اور میں نے بمشکل ڈرم میں ڈالا۔ صابر

نے کین سے نالی لگا کر تیزاب ڈالا۔ یوں چوتھا لڑکا بھی فارغ ہوگیا۔ میں نے اس کا نام تک نہیں پوچھا کیونکہ نیند کی گولیوں میں بہت جلدی صابر نے کر دی تھی۔ مجھے نام کی ضرورت بھی نہیں تھی

۔

3 جولائی: شام سات بجے امی اور سعید ساتھ سہیل بھانجا آئے۔ امی نے میرے دو سوٹ سلا کر مجھے دیئے۔ ایک امی اور ایک بہن نے بھجوائے تھے۔ امی کی محبت دیکھ کر پریشان رہا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر امی چلے گئیں۔ میں سوچتا رہا کہ جب میں مروں گا تو امی کیسے برداشت کریں گی۔

5 جولائی: آج ایک موٹا سا لڑکا، رنگ پکا تھا مگر خدوخال خوبصورت تھے صابر لے آیا۔ نام شریف تھا، بھائی پھیرو کا رہنے والا تھا۔ گھر کا ایڈریس پوچھا تو بتانے سے گریز کیا، ٹال دیا۔ کل رات سے یہاں تھا۔ رات کو سوتے ہوئے صابر نے چھ گولیاں والیم 10 دی تھیں مگر لڑکے یہاں دو کام پر بھی تھے موقع نہ ملا۔ آج صبح چھ بجے اسے بھی فارغ کیا۔ فارغ ہوئے ہی تھے کہ بھانجا شہزاد آیا اور بتایا کہ امی بہت بیمار ہوگئی ہیں۔ دل کا دورہ ہے ہسپتال داخل ہیں ۔ فوراً صبح صبح ہسپتال چلے گئے۔ امی کی حالت بہت خراب تھی۔ امی کو دراصل میرے دکھ نے یہاں پہنچا دیا تھا ۔ میرے قاتلوں نے صرف میرا قتل نہیں کیا تھا میری ماں بھی میری حالت دیکھ دیکھ کر دل کی مریض ہوگئی تھی۔ 3 جولائی کو رات آٹھ بجے سعید کے ساتھ میرے ہاں آئی، میرے لئے دو سوٹ سلے لائی، ساتھ کالی مہندی سر کے لئے، دو عدد نالے بھی لائی تھی۔ میری حالت ایسی کہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ بہت دکھ کرتی رہی تھی۔ میرے قاتل میری ماں کو اس حالت میں پہنچانے والے ہیں۔ امی کی اس حالت کے ذمہ دار وہی ہیں جنہوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ اپنی کاروائیوں کا مجھے کوئی دکھ نہیں۔ میری ماں روتی یہاں تک پہنچ گئی تو بہت لوگوں کی مائیں بھی مریں گی۔ پانچ قتل آج تک ہو گئے مگر میرے دل میں کوئی کچھ نہیں ہے جیسے میری ماں مر رہی ہے خدا کرے دوسرے لوگوں کی مائیں بھی ایسے ہی مریں۔ جیسے میں تڑپ تڑپ کر جی رہا ہوں خدا

کرے میرے ہاتھوں مرنے والے بھی ایسی تکلیف سے مریں غریب سمجھ کر ملازم رکھا تھا وہی ملازم میرے قاتل ہوئے۔ اگر غریب ظالم ہیں تو اب مرتے وقت میں بھی ان سے بدلہ لوں گا اور اپنی سمجھ سے درجنوں قتل کروں گا۔ انشاءاللہ۔

9 جولائی: امی کو ڈاکٹروں نے مشینیں لگا کر بمشکل زندہ رکھا ہے۔ میں رکشہ میں صبح سے رات تک ہسپتال رہتا ہوں۔ وہاں سب بھائی اور بہن اور بھابھیاں وقت دیتی ہیں۔ سب امی کو بچانے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ پانچ جولائی سے اب تک میں روزانہ وہاں جاتا ہوں۔ رات تک ہسپتال کے باہر رہتا ہوں۔ میں نے اشارہ میں اقبال جس کو میں نے بچپن سے پالا تھا بتایا کہ اب میری زندگی کی کوئی حالت نہیں ہے۔ مجھے ملازموں نے قتل کر دیا تھا میں بھی ایسی حالت میں ہوں کہ اپنا انتقام لے لیا ہے۔ اقبال نے تفصیل چاہی اور اس کو مذاق سمجھ کر ہنسی میں ٹال دی۔

12 جولائی: امی کی حالت سے دل زیادہ پریشان ہوگیا۔ میں نے ظفر کو کہا کہ بندہ لائے۔ وہ ملتان کا لڑکا عمران لے آیا۔ چودہ پندرہ سال کا لڑکا تھا۔ اسے ظفر اور میں نے ختم کیا۔ آج لڑکوں کے ساتھ صابر کو یادگار بھجوایا ہے۔ ظفر نے اٹھا کر میرے ساتھ ڈرم میں رکھا۔ پہلے ڈرم میں موجود کالا تیزاب لیٹرین میں الٹایا۔ بالٹیوں کے ساتھ خالی ہونے پر نیا ڈال دیا، یوں چھٹا قتل بھی ہوا

۔

13 جولائی: آج ایک لڑکا حنیف شاہ عرف بیٹا فیصل آباد کا تھا۔ ظفر اور صابر نے اسے ختم کیا اور ڈرم میں رکھا۔ امی کے دکھ میں، میں نے کھلی اجازت دے دی ہے۔ حنیف کی عمر چودہ سال ہے ۔آج ناصر صاحب آئے۔ آج تک کی ساری کاروائی بتائی۔ انہیں ڈرم بھی دکھائے۔ ناصر صاحب چند گھنٹے رہ کر چلے گئے، کاروائی سے خوش ہوئے۔

14 جولائی: آج ظفر اور صابر نے اختر نامی ملتان 24 چک کا لڑکا، عمر پندرہ سال کو ختم کیا۔ میں

نے انہیں کھلی اجازت دے دی ہے کیونکہ میری ماں مر رہی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے دکھ سے مر رہی ہے۔ میرا قتل کرنے والوں کی وجہ سے میری ماں کا یہ حال ہے۔ اب ہسپتال سے میں یا تو لیٹ جاتا ہوں یا پھر جا کر جلدی آتا ہوں۔

15 جولائی: آج نسیم مرشد آئے اور ایک شیخو پورہ کا لڑکا لائے، عمر سولہ سال ہوگی۔ راستے میں اسے چھ گولیاں نیند کی دے آئے۔ وہ آتے ہی سو گیا۔ پھر گیس ماسک کی مدد سے ختم کیا۔ جلدی میں، میں نے نام تک نہ لکھا۔ صرف صابر موجود تھا۔ نسیم صاحب اور صابر نے کام مکمل کیا۔ نواں قتل یوں مکمل ہوا۔

16 جولائی: آج ظفر ماجد (ماجو) حویلی لکھا کا لڑکا لے آیا۔ ظفر اور صابر نے ختم کیا اور کام مکمل کیا۔ ڈرم بھی لیٹرین میں گرائے۔ بالٹیوں کی مدد سے اور پانی گرایا۔ بعد میں ماجد کو ڈرم میں گرا کر تیزاب ڈالا۔ امی بدستور نازک حالت میں ایمرجنسی میں ہے۔ میں امی کی حالت دیکھتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ پورا شہر ہی ختم کر دوں۔ لڑکوں کو میں نے پوری اجازت دے دی۔ 13 جولائی سے 16 جولائی تک ہر روز ایک قتل کیا ہے۔ لاش دو روز میں پانی ہو جاتی ہے اور پھر لیٹرین کے راستے گھر سے چلی جاتی ہے، یہی میرا انتقام ہے۔ ان لوگوں کی مائیں بھی میری ماں کی طرح تڑپ تڑپ کر مریں گی۔ میری طرح سسک سسک کر جئیں گی۔

19 جولائی: ظفر سولہ جولائی سے آنہیں رہا، بہت پریشانی ہے۔ ساجد کو میں نے شامل نہیں کیا۔ اسے کہا ہے کہ کیمیکل میں کسی دوست کی خاطر منگوا رہا ہوں جو صبح آ کر لے جاتے ہیں اور خالی کین دے جاتے ہیں۔ ساجد نشہ کرتا ہے، چرس اور صمد بونڈ پیتا ہے۔ صبح دیر سے اٹھتا ہے اس لئے اعتبار کرتا ہے۔ وہی کینوں میں تیزاب خرید کر لاتا ہے۔ کبھی کبھی نسیم صاحب اور ظفر بھی لاتے ہیں۔

20 جولائی: آج بیس جولائی کو نسیم صاحب کسی جگہ سے شہزاد چٹا کو لے آئے۔ اس لڑکے پر

ساری زندگی میں نے بہت احسان کیئے مگر وہ میرا نہ بنا بلکہ دشمن بنا رہا ہے۔ چٹے کو نسیم صاحب نے چرس پلائی۔ جوس میں والیم 10 دیئے اور چار گولیاں اسے نشے کی کھلا دیں۔ اسے ختم کرنے پر میں نے مرشد کا بہت شکریہ ادا کیا۔

21 جولائی: آج میں نے ظفر اور صابر کو تاکید کی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں دنیا میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے لوں۔ اب کام کی رفتار بڑھا دو۔ آج عجیب بات یہ ہوئی کہ رات دس بجے مولوی ریاض، عاشق اور بھٹی جو فتح گڑھ میں میرے گہرے دوست اور محلّہ دار تھے، وہ آ گئے۔ پک اپ میں ساتھ صندوق تھا وہ میرے گھر لے آئے۔ مجھے علیحدہ ہو کر کہا کہ ملازموں کو بھیج دو۔ میں نے لڑکے ملازم یادگار بھجوا دیئے۔ صندوق انہوں نے کھولا تو اس میں پچاس پچپن سالہ ایک آدمی کی لاش تھی، تازہ تھی کیونکہ اکڑی ہوئی نہیں تھی۔ اسے گلے میں پھندہ دیا گیا تھا۔ مجھے کہا کہ اس کا کچھ کرو۔ میں نے ڈرم والا کمرہ کھولا۔ انہوں نے ڈرم میں ڈال کر تیزاب ڈال دیا۔ بتایا کہ دشمن تھا وہاں گھر میں ہم نے مارا اور صندوق میں ڈال کر لے آئے۔ میرے بہت شکر گزار ہوئے۔ میں نے سوچا کہ چلو اس بہانے ان کے احسانات کا بدلہ ہو جائے گا، پھر چلے گئے۔

22 جولائی: آج صابر اور ظفر تین لڑکے لائے۔ ہم تینوں نے نیند کی حالت میں تینوں کو ختم کیا۔ ان کے نام عمران سیالکوٹ سے تھا، موٹا جسم تھا، رنگ سفید، صحت مند۔ دوسرا نیامت تھا جو اپنا اتا پتہ نہیں بتاتا تھا۔ تیسرا مظفر آباد کا پٹھان تھا۔ یہ بھی اپنا اتا پتہ اور نام نہیں بتاتا تھا۔ تینوں کو ختم کر کے دونوں ڈرموں میں ڈالا۔ آج پہلی دفعہ ایک روز میں تین ہلاک کیئے۔ اب ہمارا حوصلہ بلند تھا۔ ہم گھروں سے بھاگے ہوئے آوارہ لڑکوں کے یادگار میں منتظر ہوتے۔ لڑکے ہمیں بیوقوف بنانے کے لئے آ جاتے اور پھنس جاتے۔

23 جولائی: آج سبز منڈی سے ظفر ایک لڑکا لایا جو سبز منڈی کا رہائشی تھا۔ میں نے مقامی لڑکے کی مخالفت کی مگر ظفر نے کہا کہ کسی نے مجھے لاتے نہیں دیکھا۔ لڑکا گھر سے بھاگا تھا۔ اس کا نام

سنی شوکت تھا، عمر چودہ سال تھی، اسے ختم کر دیا گیا اور تیزاب کے حوالے کر دیا جہاں کل تک لاش بھی غائب ہو جانا تھی۔ آج ہمارے قتل شدہ لوگوں کی گنتی پندرہ ہو گئی تھی۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی ۔میں نہ تو چل سکتا ہوں نہ لاش اٹھا سکتا ہوں۔لڑکوں نے میرے ساتھ ایسا ساتھ دیا ہے کہ جس کا کوئی بدل نہیں دے سکتا۔

25 جولائی: پے در پے ہماری کامیابی نے ہمارے حوصلے بلند کر دیئے ہیں۔ڈرم میں ایک وقت میں تین لاشیں آسکتی ہیں۔دو کین تیزاب ڈال کر اسی رات پگھلا کر ہوا پانی ضائع کرنے کے بعد پھر دو کین ڈالنے سے اگلے دن چند ٹکڑے باقی رہے تھے جن کو پھر تیزاب میں ڈال دیتے تھے۔ یہ دنیا سے میرا بھر پور انتقام ہے۔

26 جولائی: آج امی فوت ہوئیں۔مجھ پر قیامت ٹوٹ گئی۔امی ہی میرے لئے اس حالت میں سب کچھ تھی۔امی کو صرف میرا غم قتل کر گیا۔میرے قاتل میری ماں کو بھی قتل کر چکے تھے۔اب میں انشاء اللہ دنیا سے بھر پور بدلہ لوں گا، اپنا بھی اور اپنی ماں کا بھی اور دنیا کی سینکڑوں ماؤں کو رلا رلا کر ماروں گا۔انشاء اللہ جیسے میری ماں ختم ہوئی بہت ختم ہوں گی۔میں نے غلطی کی جو صرف اسی لالچ میں گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکے ملازم رکھے کہ یہ رات دن رہیں گے۔یہی میری غلطی تھی جو میں نے لاوارث خیال کر کے انہیں سہارا دیا۔سوچا کہ یہی ساتھ دے دیں گے مگر وہ مجھے ہی قتل کر کے بھاگ گئے۔ایک گرفتار ہوا مگر ایس۔ایچ۔او نے اسے اپنے خاص مقام پر گھر پہنچا دیا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔منہ پر کالی داڑھی کا بھی ایس۔ایچ۔او نے خیال نہیں کیا۔میرے ہاتھوں قتل کا جب دنیا کو پتہ لگا تو دیکھوں گا کہ اس کو بھی کون بچائے گا، پولیس یا لوگ مجھے انصاف کرتے نہیں نظر آتے۔

امی کی وفات پر میں نے بہت افسردگی میں دفنانے کے بعد اپنے بھائیوں حاجی سعید، پرویز، ضیاء، امین بہنوئی اور شاہد بہنوئی کو رات کو کہہ دیا کہ میرے پاس ایسا فارمولا ہے کہ میں آدمیوں کو

ناصرف ختم بلکہ ان کی لاشوں کو بھی غائب کررہا ہوں۔ میرا تجربہ سو فیصد کامیاب ہو چکا ہے۔ میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بھرپور بدلہ لے سکتا ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی بے پر کی بات نہیں کی اس لئے سب حیران رہ گئے۔

26 جولائی: حاجی اعجاز کو میں نے علیحدگی میں یہاں تک کہہ دیا کہ میں روز لاشوں پر سوتا ہوں۔ میں بہت دور جا چکا ہوں، میری طرف سے کسی بری خبر کے لئے دل کو مضبوط رکھنا۔

حاجی اعجاز نے شاید ضیاء سے بات کی۔ ضیاء نے گلی میں لے جا کر مجھ سے تفصیل سے بات کی۔ میں نے سب کچھ سچ مچ بتا دیا۔ ضیاء کی بیوی اسے چھوڑ گئی ہے۔ اس نے میری بات پر بہت خوشی کا اظہار کیا ہے اور کہا کہ یہ دنیا ختم کرنے کے قابل ہے، تم بالکل درست کر رہے ہو۔ میری حمایت تمہارے ساتھ ہے۔

30 جولائی: آج میرا پرانا ملازم سرفراز آ گیا۔ خبیث ڈیڑھ سال پہلے ہمیں چھوڑ کر منڈی آ گیا تھا۔ یہ بھی گھر سے بھاگا تھا۔ یہ ہمیں داتا دربار سے ملا تھا۔ ان دنوں میں داتا دربار میں روز روٹی بانٹنے جاتا تھا۔ یہ ہمارے ساتھ دو بار مری ایک بار رحیم یار خاں بھی گیا تھا۔ یہ ٹور میں نے ایک ہی مہینے میں تین بار کئے تھے مگر سرفراز آتے ہی بھاگ گیا، مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ ظفر اور صابر نے صبح چار بجے رات کو ہی اس کا کام تمام کر دیا کیونکہ ظفر آج صبح ساڑھے تین بجے آ گیا تھا سرفراز سو رہا تھا اس کی گردن میں زنجیر ڈال کر کھینچ کر فقیر نے کام مکمل کیا۔ مجھے یہ طریقہ بھی بہت پسند آیا کیونکہ اس میں زہریلی گیس سے بھی پہلے کام ہو گیا تھا۔ میں نے اس طریقہ کو بھی استعمال کرنے کا ظفر اور صابر کو کہہ دیا۔ سرفراز اور شہزاد چٹا میرے پرانے ملازم تھے مگر انتہائی بدذات تھے۔ ان کے قتل میرے لئے بہت بڑی کامیابی ہے۔ ان پر میرے بہت احسانات تھے مگر یہ ہمیشہ نقصان پہنچاتے تھے۔ پٹھانوں کو اس لئے شوق سے قتل کرتے تھے کہ میرا قتل بھی ایک پٹھان نے کیا تھا۔

یکم اگست: آج شجاع آباد کا ایک انیس سالہ نوجوان ہتھے چڑھ گیا۔ اسے بھی ظفر لایا تھا منڈی

سے۔اس کا نام نعمان تھا۔اسے بھی ظفر اور صابر نے ختم کیا۔کام ہو گیا، اتوار کا دن تھا، صبح دس بجے کا ٹائم تھا کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔دیکھا تو نسیم مرشد صاحب آئے تھے۔انہیں لاکر لاش دکھائی اور اب تک کی ساری کاروائی بتائی انہوں نے مجھے شاباش دی اور دو دو سو روپے ظفر اور صابر کو انعام دیئے، میرا دل بہت خوش ہوا۔

3 اگست: آج فیصل آباد کا تیرہ سالہ عمران نامی لڑکا یادگار سے ملا۔جھنگ روڈ پنڈ باؤ والا 220 (رب) پتہ بتایا۔ظفر اور صابر نے کام تمام کیا اور اس طرح آج گنتی اٹھارہ ہوگئی ہے۔

4 اگست: ظفر اور صابر نے میرے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خون کی ندیاں بہانے کی قسم کھائی تھی۔آج پھر ایک لڑکا بابر ملتان کا تھا، اس کو ظفر منڈی سے لایا۔پندرہ سال عمر تھی۔بابر نے پتہ سوفٹی ملتان بتایا۔دراصل یہ گھر سے بھاگے ہوئے لوفر لڑکے اپنا نام پتہ درست نہیں بتاتے۔زیادہ پوچھ گچھ ہونے سے چوکس ہو جاتے ہیں۔ہمارا مقصد کسی کے گھر بار سے نہیں۔میں نے رحم کر کے دولڑکے ملازم رکھے تھے انہوں نے بے دردی سے میرا قتل کیا، مجھے بے گناہ کو قتل بلا وجہ کیا گیا۔میں بھی بے گناہوں کو اپنے ساتھ اوپر لے جا رہا ہوں۔مجھے اللہ تعالیٰ نے بائیس روز بعد دوبارہ زندہ کیا تھا۔میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اوپر ہونے والے ظلم پر تھوڑی مہلت لے کر دنیا میں دوبارہ آیا ہوں، نہ تو چل سکتا ہوں اور نہ دیکھ سکتا ہوں، نہ کھا سکتا ہوں کیونکہ دماغ کی چوٹیں بدستور دماغ گھماتی ہیں، آنکھ ختم ہو چکی ہے، منہ کے جبڑے ٹوٹے ہوئے ہیں۔پہلی بار نوجوان لڑکے دھوکہ کھا کر ملازم رکھے تھے انہوں نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا جس کی وجہ سے میری بے گناہ ماں بھی مرگئی۔بدھ کی تاریخ کو بابر کو قتل کیا گیا۔میں ظفر اور صابر کے احسان کو فراموش نہیں کر سکتا۔

6 اگست: آج ظفر اور صابر کے ساتھ نسیم مرشد جو کہ آج صبح ہی آگئے تھے منڈی فروٹ سے ایک چودہ سالہ غلام محی الدین ولد عبدالمجید کو ساتھ لے آئے۔یہ لاہور کا ہی رہنے والا تھا۔محلّہ

اسلام پورہ گلی نمبر دکان نمبر 22 فون پی۔پی۔550141 اس نے مجھے فون لکھوایا۔
نسیم صاحب اس لڑکے پر فدا ہو گئے۔لڑکا خوبصورت تھا۔ پہلے اس کی شلوار اتار کر اندر لے گئے، ایک گھنٹہ بعد کمرہ کھولا اور ظفر اور صابر کو بلایا، اس کا کام تمام کیا۔زبردستی نیند کی آٹھ گولیاں اسے کھلائیں۔ہوش میں ہی گیس ماسک لگا کر گیس لگائی۔مرتے ہوئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر مرشد کے آگے اس کی نہ چلی، کام تمام ہوا تو ڈرم کے سپرد کر دیا۔مرشد کا میری خاطر انسانی خون سے کھیلنے پر میں مرشد کا بہت احسانمند ہوں۔مرشد نے گزشتہ بیس سال سے بجا طور پر دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔زندگی بھر میں نے ہر موقع پر مرشد کو ہر برے وقت پر اپنا ساتھی پایا ہے۔ مرشد اس بار جب کہ میری زندگی کا دیا بجھنے والا ہے میرا ایسا ساتھ دے رہا ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی اس کا مشکور و ممنون ہوں گا۔آج ناصر ساجد کو بھی یاد کرتے رہے۔ناصر کو ساری حقیقت دکھائی تھی۔ان کے ساتھ بلکہ سامنے انسان کو قتل بھی کیا تھا مگر انہوں نے اپنے مخالف کو لا کر ختم کرنے کا منصوبہ بنایا مگر اب تک دوبارہ آئے نہیں۔

9 اگست: امی کی وفات پر میں نے دل برداشتہ ہو کر لیاقت علی کو' جو نیو شاد باغ میں کارخانہ کرتا ہے' سارے حالات بتا دیئے اور کہا تھا کہ اب میں بھی جانے والا ہوں مگر لیاقت علی نے مجھے ہر طریقہ سے سمجھایا کہ اگر مرنا ہے تو مارتے رہو کیونکہ تمہارا قتل ہم برداشت نہ کر سکے تھے۔لیاقت علی جو میرا ماموں زاد بھائی ہے اس کی بات سے میں نے حوصلہ کیا تھا۔ میں لیاقت علی کا احسان نہیں بھول سکتا۔اللہ اس پر رحمت کرے۔آمین

10 اگست: آج ظفر اور صابر صبح چھ بجے یادگار گئے۔ظفر صبح منڈی کے ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ چھٹی ہونے پر پانچ بجے یہاں آ جاتا ہے' تین بجے دوپہر تک یہاں رہتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔صبح سویرے یادگار سے مردان کا ایک پٹھان لڑکا لے آیا، سولہ سالہ بھرپور صحت مند مجھے تو بنوں کو ہاٹ کا اپنا قاتل ہی نظر آیا، اس سے بہت مشابہ تھا۔ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً کھانے میں نیند دی وہ

پھر بھی نہ سویا تو ظفر نے اس کی گردن میں کتے والی زنجیر ڈال کر کھینچ دی، ایسے ہی اسے ختم کیا۔ پھر وہ دوبارہ گئے اور راولپنڈی کا پٹھان چودہ سالہ لائے۔ اس کو بھی گردن میں پھندا ڈال کر ختم کیا اور ڈرم کے سپرد کر دیا۔ ظفر کو آج کی کاروائی پر میں نے پانچ سو انعام دیا، صابر کو بھی پانچ سو انعام دیا اور بہت شاباش دی۔

11 اگست: آج ظفر نہیں آیا صرف صابر تھا، اس کو بازار میں لڑکا قاسم تیرہ سالہ مل گیا، فیصل آباد کا تھا، اس کا کام میں نے اور صابر نے تمام کیا۔ گیس اور نیند کی گولیاں کام آئیں۔ صابر اور میں نے بمشکل ڈرم میں رکھا۔

12 اگست: آج امی کا جمعرات والا ختم شریف سعید کے گھر تھا۔ میں نے چار تا رات آٹھ بجے تک وہاں پڑھائی کی اور ختم شریف میں شرکت کی۔ آج فتح گڑھ سے بھائی عاشق اور مولوی ریاض صاحب بھی میری خبر لینے آئے۔ ریاض صاحب نے بوڑھے کی لاش ٹھکانے لگانے پر بہت شکر گزاری کی۔ بھائی صابر کئی آدمی مارنا چاہتے تھے میں نے اجازت دی، انشاءاللہ جلد اس کی لاش بھی لائیں گے۔ یہ گنتی میری گنتی میں شامل نہیں ہے۔

13 اگست: آج ظفر فتح گڑھ، جہاں میں قتل ہوا وہاں کا لڑکا گھر سے بھاگا ہوا تھا، ظفر کا واقف تھا کیونکہ وہاں دو سال تک ظفر میری ویڈیو گیم کی دکان چلاتا تھا، لڑکے کو بارہ تاریخ کو ظفر لایا۔ رات اسے فلمیں دیکھنے ٹی وی پر دیں۔ ظفر صبح چار بجے آ گیا۔ اسے اندر کمرے میں سلایا تھا۔ ملازم لڑکے دوسرے کمرے میں گئے اور ظفر اور میں دونوں نے کام تمام کر دیا، اٹھا کر اندر کمرہ کھولا، ڈرم میں رکھا اور تیزاب ڈال کر فارغ ہو گئے اور پھر دوبارہ سو گئے۔ اٹھ کر لڑکوں کو کہہ دیا کہ وہ صبح سویرے چلا گیا ہے۔ سو کر اٹھے تو لڑکوں کو باہر کھیلنے بھیج دیا اور ظفر اور صابر ایک نوجوان بیس سالہ لڑکا لے آئے۔ اس کو نیند دے کر گیس سے بے ہوش کیا۔ عبدالجبار نام تھا، فیصل آباد کا رہنے والا تھا، دوپہر اڑھائی بجے کام مکمل ہوا۔ صابر باہر گیا تو غیر ارادی طور پر وہاں آئے دو

لڑکے اور مل گئے۔

13 اگست: چودہ سالہ لڑکا تھا توقیر اس کا نام اور فیصل آباد کا رہنے والا تھا اور اٹھارہ سالہ رمضان بورے والا وہاڑی کا تھا۔ لاتے ہی بڑی محبت سے ملک شیک پلایا، تیز میٹھا میں نیند کی آٹھ گولیاں ملائیں اور ٹی وی چلا دیا، تھوڑی دیر میں وہ سو گئے تو منہ پر ماسک سے گیس دی، گیس سے پہلے دونوں ہاتھوں کو زنجیر سے تالا بند کر دیا۔ دونوں ہاتھوں کو تالے چھوٹے چائنہ کے لگا دیئے اور ختم کر دیا۔ دونوں کو ڈرموں میں ان کے ساتھ ڈال دیا۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ آج میں نے اور صابر نے بہت مشکل سے ڈرم میں رکھے۔

17 اگست: جمعہ 13 اگست کو چار نوجوان ختم کئے تھے۔ ان کو ختم ہونے میں چار دن لگ گئے۔ بار بار تیزاب کالا ہونے پر گٹر میں ڈالتے پھر نیا کین ڈال دیتے۔ اس کامیابی سے بہت حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ آج 17 اگست تھا صابر ایک بہت ہی خوبصورت موٹا گورا سا لڑکا تیرہ سالہ اور ساتھ بارہ سالہ لڑکا لایا۔ سجاد اور افضال نام تھے۔ نارنگ منڈی اور وہاڑی کے تھے، ہم دونوں نے ختم کئے اور ڈرم میں ڈال دیئے۔ کام صبح 17 اگست کو کیا 16 اگست کو ملے تھے۔

18 اگست: آج نسیم مرشد آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک 16، 17 سالہ لڑکا منصور عرف بلا بھی یہ وہ یادگار میں ٹھہر کر ساتھ لائے تھے۔ شکر گڑھ کا تھا۔ شام تین بجے سے پانچ بجے تک صابر، نسیم مرشد اور میں نے اسے ختم کیا اور حوالہ ڈرم کر دیا جہاں کل تک ہڈیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ ان چند دنوں میں بھرپور کامیابیاں حاصل کی گئی تھیں۔ موجود لڑکوں کو فارغ کر دیا تھا۔ اب ہم اکیلے تھے، سارا دن یونہی کام میں لگے رہتے، کبھی گٹر میں گراتے، کبھی نئے تیزاب میں گراتے۔

19 اگست: آج امی کا جمعرات کا ختم شریف تھا۔ میں چار تا آٹھ بجے گیا۔ دو لڑکے کل شام قابو آئے تھے، ایک کا نام رمضان 17 سال عمر اور دوسرا کاشف عمر 12 سال تھا۔ دونوں بورے وہاڑی سے آئے تھے۔ کل رات آٹھ بجے یہ صابر کو یادگار سے ملے جہاں بڑا چھوٹے سے مذاق

کرتا ہوا ملا۔صابر انہیں لے آیا کہ میرا چھوٹا بھائی گمشدہ ہے اس کو میرے ساتھ ڈھونڈو۔سو روپے فی کس روزانہ دوں گا۔یہاں رات سوئے۔صبح آج پانچ بجے ظفر کے آنے پر قتل کر دیئے گئے۔شاید دونوں بھائی تھے مگر بڑا چھوٹے سے بدفعلیاں کرتا تھا۔یہاں رات کو دونوں بھائیوں کو سونے کے لئے اندر بھیجا،دروازہ باہر سے بند کر دیا۔رات کو اچانک اندر گئے تو بڑا چھوٹے سے بدفعلی کرر ہا تھا۔ہم حیران رہ گئے۔بڑا بالوں والا تھا،اس کے بال پکڑ کر تھپڑ لگائے۔چھوٹے نے بتایا کہ میرا بھائی ہے مگر کئی سال سے مجھ سے روزانہ بدفعلی کرتا ہے۔مجھے گھر سے بھگا کر یہاں لایا ہے اور پلاٹوں میں ایسا ہی کرتا ہے۔دونوں کو ختم کر کے ہم نے خوشی محسوس کی۔آج گنتی 32 ہوگئی ہے۔ایک لڑکا کامران نیازی بھی،آنکھیں خوبصورت،عمر تیرہ سال،رنگ گورا،جسم صحتمند ہمارے ہاتھ لگ گیا۔فیصل آباد سے بھاگا ہوا تھا۔کل رات یادگار سے ملا تھا۔رات یہاں سویا اور ظفر کے آنے پر رات ساڑھے تین بجے اس کا خاتمہ گلے میں پھندا ڈال کر کیا گیا۔انتہائی خوبصورت تھا مگر دل پتھر ہو چکے تھے۔یہ 33 واں قتل تھا۔

23 اگست: آج بھی جو ملا دیکھنے کے قابل تھا۔علی شیر اس کا نام تھا۔موٹے جسم کا خوبصورت، چٹا گورا لڑکا تھا،عمر تیرہ سال تھی۔کل رات یہ بھی یادگار سے ملا (جہاں میرا قاتل مجھے ملا تھا)،دیپالپور کا تھا۔رات اس کو یہاں سونے دیا گیا۔صبح تین بجے رات کو ظفر آیا تو سوتے میں گلے میں سنگل یا زنجیر ڈال کر کھینچ دیا ایک منٹ میں بے سدھ ہو گیا۔اب یہی طریقہ مسلسل استعمال کرتے ہیں۔

24 اگست: میں نے امی کی وفات پر دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا تھا اس لئے شام کو چاروں بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی میں کہا کہ میں انسانوں کو عبرتناک قتل اور قتل کے بعد لاشیں غائب کرنے پر قادر ہوں۔کہا گیا کہ کتنے مارے تو میں نے سب کی موجودگی میں اقرار کیا کہ میری گنتی لوگوں کو پریشان کر دے گی۔نجانے میں نے جذبات میں کیا کیا کہا سب پریشان

ہو گئے ۔آخر متفق اس بات پر ہوئے کہ مجھے بھی بہت بے رحمی سے قتل کیا گیا یہ میرا حق ہے کہ اپنا بدلہ لوں ۔بات آئی گئی ہوگئی تھی مگر میں نے خودکشی کا ارادہ بدل دیا تھا۔اب میں پریشان ہوں کہ رشتہ دار کوئی مشورہ کر کے نقصان نہ پہنچائیں۔

25اگست: کل سرگودھا کا دلشاد عمر پندرہ سال ہمارے نرغے میں آ گیا۔ یہ بھی گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ یہ بدفعلی کے شوق میں ظفر کے ساتھ آ گیا تھا۔ پھر آج سبزی منڈی سے لائے گئے دلشاد کو ختم کیا صبح پانچ بجے کیونکہ وہ چار بجے آتا ہے۔کل رات اسے چھوڑ گیا تھا رات کو آنے کا کہہ گیا تھا۔ ظفر نے گردن برابر کر دی۔ایسے لڑکوں سے مجھے چڑ ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اس کا خاتمہ بھی ضروری تھا۔

(ڈائری میں اسے طرح کی 26 اگست' 28 اگست' 29 اگست' 30 اگست' 31 اگست' 2 ستمبر' 7 ستمبر' 8 ستمبر' 9 ستمبر 12 ستمبر' 13 ستمبر' 15 ستمبر 18 ستمبر' 22 ستمبر' 24 ستمبر' 25 ستمبر' 26 ستمبر' 27 ستمبر' 29 ستمبر 30 ستمبر' یکم اکتوبر' 3 اکتوبر' 5 اکتوبر 6 اکتوبر 7 اکتوبر 9 اکتوبر' 12 اکتوبر' 16 اکتوبر' 17 اکتوبر 21 اکتوبر' 23 اکتوبر' 24 اکتوبر 28 اکتوبر 29 اکتوبر' 30 اکتوبر' یکم نومبر' 3 نومبر' کی تحریریں بھی شامل تھیں)

6 نومبر۔آج میرے تینوں بھانجے وسیم پرویز، شہباز اعجاز اور نومی جبار پانچ بجے شام کے ایک بہت خوبصورت سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ یہاں آ گئے ۔لڑکی بہت پریشان تھی۔ مجھے علیحدہ ہو کر وسیم نے کہا کہ انکل ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں ہمیں بچاؤ۔ میں نے پوچھا تو کہا کہ یہ لڑکی ہمارے گھر میں کام کرتی ہوئی لڑکی کی سہیلی ہے اور کسی گاؤں سے گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ ہم نے اسے نوکرانی کے طور پر ایک ہفتے گھر میں رکھا۔ یہ اس دوران مجھ سے سیٹ ہوگئی۔ میں نے نومی اور شہباز سے بھی اسے ملوایا۔ سب مل کر اس لڑکی کو استعمال کرتے رہے۔ پھر یہ چلی گئی اب تین ماہ بعد آئی ہے اور کہتی ہے کہ بچہ ہونے والا ہے کچھ کرو ورنہ میں اپنے والدین کو

لا کر مقدمہ کر دوں گی، تم مجھ سے شادی کرو۔ میں اسے یہاں لایا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔ آپ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے میں کوئی مدد کر رہے ہیں تو اس لڑکی سے ہماری جان چھڑاؤ۔ میں نے ہاں کر دی مگر اسی اثنا مجھے ساجد نے بتایا کہ ملازم لڑکے شہزاد نے آپ کی باتیں سائیڈ پر بیٹھ کر سن لی ہیں اور مجھے بتایا کہ بھائی جان اس لڑکی کو مارنے والے ہیں۔ میں نے شہزاد جو جھنگ کا ہے کو یہاں رکھ کر دوسرے لڑکے کو ساجد کے ساتھ باہر بھیج دیا اور وسیم کو زنجیر دے کر کہا کہ لڑکی کی گردن میں اچانک پیچھے سے ڈال کر کھینچ دو اور خود لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ وسیم پیچھے سے کھڑا رہا۔ شہزاد دوسرے کمرے میں تھا ۔ دروازہ ہم نے بند کر دیا تھا۔ اب وسیم نے اچانک زنجیر ڈال کر لڑکی کا سانس بند کر دیا۔ بہت تڑپی مگر شہباز اور نومی نے میرے ساتھ اس کو قابو رکھا اور ٹی وی کی بلند آواز میں اسے ختم کر دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ اندر موجود میرے ملازم شہزاد جو بے حد خوبصورت لڑکا ہے ختم کر دو۔ وسیم نے اسے بھی پکڑ کر زبردستی زنجیر ڈالی اور اسے بھی تینوں نے بڑی مشکل سے ختم کر دیا۔ اب دونوں لاشوں کو میں نے ان کے ساتھ ڈرموں میں رکھ کر تیزاب تینوں سے ڈلوایا اور کام ختم کیا۔ ان کے سامنے لڑکی اور شہزاد کی تصویریں نہیں بنا سکا، نہ ہی لڑکی کا اتا پتہ ان کے سامنے پوچھا۔ جب کام پر رکھا، لکھا تھا کام آیا۔ تینوں یہ دو قتل کر کے بہت خوش اور دلیر ہوئے۔ میں نے سمجھایا کہ تیزاب کی بات کسی سے نہ کرنا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ عمل کریں گے اور چلے گئے۔

7 نومبر: آج اتوار تھی۔ دوپہر دو بجے مرشد نسیم اور مغلپورہ سے یاسین آ گئے۔ آج مرشد نسیم اپنے ساتھ ڈی ایس پی مرحوم مرزا سلیم بیگ کے بیٹے اور میرے دوست وسیم کو بھی ہمراہ لے آئے۔ وسیم یہاں راوی روڈ میرے ہاں پہلے روز آیا تھا۔ وسیم کا ماموں جو امریکہ میں ہے وہ میرا بہت گہرا پرانا دوست ہے اور اسی رشتہ سے وسیم اور اس کا بڑا بھائی نعیم بھی میرے گہرے دوست ہیں۔ جب کرامت بھٹی نے مجھ پر زنا کا جھوٹا مقدمہ فروری 1998 کو قائم کیا تو وسیم ہی نے لین دین

طے کروا کر کرامت بھٹی سے جان چھڑوائی تھی اسی لئے میں وسیم کی بہت عزت کرتا تھا۔آج مرشد کے ساتھ وسیم کے یہاں آنے پر میں بہت پریشان تھا۔آج مرشد نے کہا کہ میں نے وسیم کو سارے حالات بتا رکھے ہیں۔وسیم کا کہنا ہے کہ جاوید کو یہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا بلکہ وسیم نے کہا ہے کہ میں بھی جاوید کا بھرپور ساتھ دوں گا اور اسی وجہ سے یہاں آیا ہے۔میں نے اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر کے صبر کیا اور تینوں کی بہت خاطر تواضح کی مگر میں بھانپ گیا کہ وسیم نسیم سے اشاروں میں ڈرموں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔آخر وسیم نے نسیم سے صاف لفظوں میں باتیں کیں۔میں نے اس پر وسیم کو کمرہ دکھانے کے لئے ساجد کے ساتھ باقی لاشیں تیزاب پر ڈرم میں تیرتی دکھائی اور اس انتقام پر میرا منہ چوم لیا اور کہا کہ تم کو یہی کرنا چاہیئے تھا۔میں بہت خوش ہوں اور سارے حالات مرشد نسیم سے دریافت کرتا رہا۔دراصل وسیم اس منظر سے ذہنی طور پر محظوظ ہو رہا تھا اور بہت خوش تھا اور یہ جان کر بہت متاثر ہوا کہ قتل ہونے والوں کی لاشیں ایک رات میں بمعہ ہڈیاں پانی بن جاتی ہیں اور واردات کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔شام چھ بجے وسیم اور نسیم مرشد نے کسی کو لا کر قتل کرنا اور وسیم کو منظر آنکھوں سے دکھانا اور ہاتھوں سے قتل کرانے کا ارادہ کیا۔مرشد نسیم سکوٹر پر اکیلے دربار چلے گئے اور ساڑھے سات بجے ایک پندرہ سالہ خوبصورت لڑکا دلشاد عرف بلی جو شیخوپورہ روڈ سے گھر سے بھاگا ہوا تھا اور سبزی منڈی اور دربار میں بدفعلی کرنے والوں کے ساتھ رہتا تھا۔میں نے آج مرشد نسیم اور وسیم کے سامنے اس کا اتا پتہ لکھا اور کیمرہ سے تصویر بنائی اور کہا کہ یہ میں اپنے ریکارڈ اور یادداشت رکھنا چاہتا ہوں۔وسیم نے کسی ریکارڈ کو اپنے پاس رکھنے سے مجھے منع کیا۔میں نے ہوں ہاں کردی مگر جلدی تصویر بنا کر کیمرہ سیف میں رکھ لیا۔مرشد نسیم اور وسیم لڑکے کو اندر لے گئے اور ایک گھنٹہ بعد کمرہ کھولا تو لڑکا ننگا تھا اور خوش تھا۔نسیم نے باتوں ہی باتوں میں گلے میں زنجیر ڈالی اور وسیم کو دی۔وسیم نے کھینچی اور اپنا شوق پورا کیا۔اس طرح نو بجے لڑکا ڈرم کی زینت بن گیا اور دس بجے تک وسیم ،نسیم اور

یاسین یہاں رہے۔آج یاسین کی طبیعت ہرنیا کی تکلیف سے تنگ تھی یاسین نے لڑکے کو استعمال نہ کیا اور کوئی کام سوائے لڑکے کو ہاتھ لگا کر دونوں کے ساتھ ڈرم میں ڈالنے کے کچھ نہیں کیا۔ میں آج یاسین کی طبیعت سے پریشان ہوا اور مرشد نے وسیم کو کہا کہ ہرنیا کے آپریشن کے لئے میں خرچہ دوں گا تم ساتھ دے کر ہسپتال میں داخل کرواؤ، مرشد مان گیا اور تینوں بہت خوش ہو گئے۔ خوبصورت گورا چٹا پندرہ سالہ لڑکا بدفعلی کروا کر زندگی ہار چکا تھا۔ یوں بچوں کی تعداد 93 ہو گئی تھی

۔

8 نومبر: میرے لئے یہ امر بہت پریشان کن تھا کہ بھائی بھتیجے اور بہت سے دوست میرے قتل عام کی آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے اور آہستہ آہستہ یہ راز راز نہیں رہ سکتا تھا اور تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اب زیادہ یہ دنیا سے چھپ نہیں سکتا ہے مگر میں مطمعن اس بات سے ہو جاتا ہوں کہ میں تو قتل ہو چکا ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے انتقام کی مہلت دی اور اب میرا مشن مکمل ہو رہا ہے۔ چند دنوں بعد 100 قتل ہو جائیں گے اور میری خواہش پوری ہو جائے گی۔ دوست زنا کاری کے شوق میں چھوٹے بڑے لڑکے استعمال کرنے کے شوق میں اور پھر اپنے گناہ کو چھپانے کے لئے قتل کرتے تھے۔ اس بہانے میں لاغر اور مجبور انسان اپنا انتقام پورا کر رہا تھا۔ میں اکیلا ہرگز ایک بھی انسان کا قتل کسی صورت نہیں کر سکتا تھا اور سب کی مدد سے میں 100 تک کی گنتی بھی پار کر سکتا تھا۔ اگر قتل سے پہلے دوست زنا کاری سے دل بہلاتے تھے تو یہ ان کی اپنی خواہش تھی۔ آج مرشد نسیم کو لے کر وسیم دوبارہ شام چار بجے آ گیا اور مرشد پھر چلے گئے اور سات بجے ایک خوبصورت نوجوان مرید کے کا سولہ سالہ لڑکا گورا چٹا لے آئے۔ بشیر احمد ولد حسن بخش اس کا نام تھا۔ لاتے ہی مرشد نے مجھ سے کام پر رکھنے کی بات کی۔ میں نے نام پتہ لکھا اور تصویر بنائی۔ پھر کپڑے نئے دینے کے بہانے اس کو نیکر دی اور بنیان دی۔ پھر مرشد اور وسیم اس کو لے کر اندر کمرے میں لے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ٹی وی کی آواز بلند کر

دی۔آج ڈیڑھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا تو لڑکا ننگا ان کے ساتھ باتیں کرتا دکھائی دیا۔ پھر وسیم نے مذاق میں گلے میں زنجیر لگائی اور مرشد نے قابو کیا اور وسیم نے زندگی سے فارغ کر دیا اور پھر ڈرم میں دونوں نے تیزاب ڈالا اور رات دس بجے چلے گئے۔یوں گنتی 94 ہوگئی ہے۔آج بلا اسحاق چار بجے شام ایک بیس سال کا چٹا گورا لڑکا ساتھ لے آیا۔ بہت چالاک تھا طاقتور تھا۔ میں اور اسحاق اکیلے تھے۔میں نے ٹی وی دیکھتے اسحاق کو 22 بور پسٹل دیا اور خود پٹاخے ماچس پر رگڑ کر اردگرد گراتا رہا۔اس دوران لوڈ پسٹل سے لڑکے امیر خان عرف ڈوڈا خان ولد مہران جان شاہ خان جو جلالپور جٹاں کا تھا کو بلا نے دماغ میں پیچھے سے گولی چلا کر ڈھیر کر دیا اور گلے میں نالے سے پھندا ڈال دیا۔ڈرم میں اسحاق بلا اور میں نے بہت مشکل سے ڈالا ،تصویر بنائی تھی۔یوں گنتی 95 ہوگئی۔

12 نومبر: آج صبح سویرے آٹھ بجے میرا سالا گوشی ندیم اور عظیم قریشی دونوں بھائی تین لڑکوں کو لے کر یہاں راوی روڈ آ گئے۔یہ لڑکے انہوں نے داتا دربار کے تہہ خانے سے صبح ورغلا کر یہاں لانے پر رضامند کئے تھے۔انہوں نے ہمیں منڈی کے کیلے کے بیوپاری بن کر دونوں کام کے لئے لائے۔یہاں میں نے ان کا اتا پتہ پوچھا لکھا اور دونوں کو اندر لے جا کر گوشی نے باتوں میں لگایا۔ایک کی گردن کو پھندا لگا کر لٹا دیا۔کپڑا ایسے اوپر ڈال دیا کہ سو رہا ہے۔پھر دوجے کو لائے اور عظیم نے پھر پھندا لگایا، پھر تیسرے کو دوسرے کمرے میں دونوں بھائیوں نے پھندا لگایا اور لاشیں ڈرم میں ڈال دیں۔یہ کام عظیم نے صرف شوق میں کیا۔انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی بدفعلی نہیں کی۔پھر دس بجے چلے گئے۔لڑکوں کے نام ثاقب علی ولد مقبول علی سکنہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، افتخار علی ولد مقبول علی ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور عمران ولد ستار ٹوبہ سنگھ کے تھے۔دونوں بھائیوں نے انہیں صرف بندے قتل کرنے کے شوق میں قتل کیا یا پھر ہوسکتا ہے میرے غم میں خون کے لئے ،مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔بہر حال گنتی 98 ہوگئی۔آج بارہ نومبر کو شام چار بجے میرے تینوں

بھانجے وسیم پرویز، شہباز پرویز، نومی ضیاء آ گئے اور باتوں باتوں میں کہا کہ انکل آپ کا قتل جس لڑکے نے کیا وہ مالش کا کام کرتا تھا۔ اخباروں میں یہی لکھا تھا۔ آپ ہمیں اجازت دیں آج ہم نے ایک مالش والا قتل کرنا ہے۔ ان کے جذبہ سے میں نے ہاں کر دی تو شہباز اور وسیم نے یادگار سے ایک مالش والا عمر میں بیس سال نام محمد عمیر اعجاز ولد محمد دین قصور کا تھا، رنگ پکا تھا لاکر مالش کے لئے نومی نے ٹانگ آگے کی۔ نیچے زمین پر فوم تھے۔ میں نے وسیم کو 22 بور پسٹل دیا جو لوڈ تھا۔ اس نے شہباز کو تھما دیا۔ شہباز نے اس پر گولی ماری۔ وسیم اور نومی نے گلے میں پھندا ڈالا، منہ پر کپڑا ڈالا، وہ ختم ہو گیا تو ڈرم میں ڈال دیا۔ تینوں خوشی خوشی چلے گئے۔ کارڈ کے بہانے میں نے مالش والے کا نام اور تصویر بنالی تھی۔ گنتی 99 ہوگئی۔

13 نومبر: آج اتوار تھا۔ نسیم صاحب صبح نو بجے حسب معمول آ گئے تھے۔ گیارہ بجے احسان اور خالق بھی آ گئے۔ میں نے مالش والے کا قصہ سنایا تو بہت خوش ہوئے کہا کہ دوسرا پٹھان تھا۔ آج ہم پٹھان ماریں گے۔ احسان اور مرشد دربار چلے گئے اور بارہ بجے ایک خوبصورت پشاور کا پٹھان سولہ سالہ محمد یاسر کو لے آئے، والد صفی اللہ خان چوکیدار تھا۔ بہت سمارٹ اور خوبصورت اور چٹا گورا تھا لاکر میں نے نام پتہ لکھا اور دوسرے کمرے میں جہاں سب تھے دروازہ بند کر دیا اور تصویر بنالی۔ پھر اسے اندر بھیج دیا جہاں خالق نے پہلے پھر احسان اور پھر مرشد نے استعمال کیا۔ دو بجے تینوں نے منہ پر کپڑا ڈالا اور گردن خالق نے دبوچی۔ احسان نے قابو کیا اور کام تمام کر دیا۔ ڈرم میں ڈال کر سب نے گلے مل کر گنتی مکمل ہونے پر مبارکباد دی۔ آج خدا کی شان اور مہربانی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب نے مربہ منگوا کر مجھے کھلایا۔ جشن سارا دن شام تک منایا پھر چلے گئے۔

==========

تیئسواں باب ... ''وہ مجسم شیطان ہے''

ترجمہ۔ رفیق سلطان۔ خالد سہیل

ایڈیشنل سیشن جج اللہ بخش رانجھا نے جاوید اقبال مغل کے مقدمے کا جو فیصلہ 16 مارچ 2000 کو لاہور میں سنایا تھا اس سے چند اقتباسات:

''اس کیس کا چالان محمد اسلم اویس حسین ڈسٹرکٹ اٹارنی لاہور نے میاں غلام حسین ایریا مجسٹریٹ کی عدالت میں سماعت کے لئے بھجوایا تھا۔ ایریا مجسٹریٹ نے 3-190- PPC کے تحت یہ کیس میاں محمد جہانگیر کے پاس عدالتی کاروائی کے لئے بھجوایا۔

میاں محمد جہانگیر، سیشن جج لاہور نے 8 فروری 2000 کو یہ کیس قانونی کاروائی کے لئے اس عدالت کے ذمے لگایا۔ ملزمان 9 فروری 2000 کو عدالت کے روبرو پیش کئے گئے۔ استغاثہ کے بیانات اور متعلقہ چھان بین کا ریکارڈ PPC Section 265G کے تحت 9 فروری کو ملزمان کے سامنے پیش کیا گیا۔ ملزمان سے یہ بھی استفسار کیا گیا کہ کیا وہ اپنے لئے وکیل کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ جب ملزمان نے بتایا کہ وہ اپنے لئے وکیل کی خدمات حاصل نہیں کر سکتے تو عدالت نے حکومت کے خرچ پر مندرجہ ذیل وکیل صاحبان کو اس کیس کے دفاع کی ذمہ داری سونپی۔

... جناب نجیب فیصل چوہدری ایڈووکیٹ جاوید اقبال کے دفاع کے لئے

... جناب عبدالباقی ایڈووکیٹ شہزاد عرف گڈو عرف ساجد کے دفاع کے لئے

... جناب اصغر علی ایڈووکیٹ محمد ندیم کے دفاع کے لئے

... جناب صفدر جاوید چوہدری محمد صابر کے دفاع کے لئے مقدمے کی حساس نوعیت اور استغاثہ

کے گواہان کی تعداد کے پیش نظر مندرجہ ذیل افراد کو سیشنل پبلک پروسیکیوٹر مقرر کیا گیا اور ان کی باقاعدہ تعیناتی کے لئے حکومت کو درخواست بھجوائی گئی۔

جناب محمد اشرف طاہر اسسٹنٹ پبلک پرسیکیوٹر جناب برہان معظم ملک' جناب محمد اصغر روکڑی' جناب امجد چٹھہ' میجر آفتاب احمد اور جناب ایم اقبال چیمہ ایڈووکیٹ کو سپیشل پبلک پروسیکیوٹر مقرر کیا گیا۔

ملزمان کے خلاف باقاعدہ مقدمہ 17 فروری 2000 کو دائر کیا گیا۔ ملزمان نے اپنے خلاف الزامات سے انکار کیا چنانچہ استغاثہ نے چالان کے ساتھ 122 افراد کو بطورِ گواہ پیش کرنے کے لئے فہرست مہیا کی جن میں سے 105 افراد عدالت کے سامنے حاضر ہوئے اور 17 افراد کی گواہی کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ استغاثہ نے ثبوت کے لئے کچھ کاغذات بھی عدالت میں پیش کیئے۔

راوی روڈ لاہور کے پولیس سٹیشن کے SHO محمد عاشق مارتھ کو اطلاع ملی کہ راوی روڈ کے مکان 16B سے کئی روز سے سخت بدبو کے بھبھکے آرہے ہیں۔ یہ مکان جاوید اقبال کی رہائش گاہ ہے۔ متعلقہ SHO اپنے ماتحت ASI محمد صدیق اور سب انسپکٹر تاجدین کو لیکر تفتیش کے لئے اس مکان پر گئے۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا لہذا وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اندر چلے گئے۔ انہوں نے وہاں دیوار پر چسپاں پوسٹر دیکھے جن سے 100 بچوں کے قتل کا عندیہ ملتا تھا۔ اس مکان کے آخری کمرے میں دو ڈرم بھی ملے جن میں تیزاب اور انسانی جسم کے اعضاء پڑے ہوئے تھے۔ SHO نے ان چیزوں کو تحویل میں لے کر ثبوت کے طور پر تھانے روانہ کر دیا۔ SHO کو تیزاب کے ڈرم میں ایک لوہے کا کڑ (Ring) اور کالا پتھر بھی ملے جو اس نے تحویل میں لے لئے۔

تفتیش کے دوران پولیس کو مندرجہ ذیل چیزیں بھی ملیں:

کسی محلول سے بھری ہوئی بوتل' ایک فرائنگ پین' ایک بڑا ٹائر' دو جگ جن پر بال چپکے ہوئے تھے' ایک ٹیوب' ایک پانچ کلووزنی لوہے کی راڈ' لوہے کے دوکلو کے دو باٹ' ایک بالوں سے چپکی ہوئی چھلنی اور کیف' پلاسٹک پائپ' دو انڈرویئر' دو پتلونیں' ایک قمیص' ایک ڈول' ایک بالٹی' ایک آئرن راڈ' ایک لکڑی کا ڈنڈا' ایک پیکٹ سوئیاں' ایک بالوں سے بھرا وائپر۔ پولیس نے ان تمام چیزوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

دوسرے کمرے سے آٹھ سفید کاغذ کے پوسٹر ملے جن پر مبینہ ملزم نے کالی سیاہی سے انسانی قتل کی وارداتوں کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تین پلاسٹک کے تھیلے ملے جن میں ۷۷ جوتوں کے جوڑے تھے۔ اسی کمرے سے ایک شو پالش' ایک کنستر اور دو کالی بوتلیں ملیں۔ ان سب چیزوں کو پولیس نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

پولیس کو پہلے کمرے سے لکڑی کے بستر سے بندھی ہوئی 16 انچ کی زنجیر اور ایک البم بھی ملی جس میں 57 بچوں کی تصویریں تھیں۔ وہاں ایک ڈائری بھی ملی جس میں سو بچوں کے نام اور پتے درج تھے۔ اسی کمرے سے جاوید اقبال کے ایکسرے بھی ملے جنہیں پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

اسی دن چند مقتول بچوں کے والدین اور رشتہ دار راوی روڈ لاہور کے جاوید اقبال کے گھر پہنچے اور اپنے بچوں کی جوتیاں اور کپڑے پہچاننے لگے۔

☆ عبدالعزیز نے اپنے بیٹے عبدالجید کی تصویر کی شناخت کی۔

☆ ظہیر حسین نے اپنے بیٹے رمیض کی شلوار اور کرتہ پہچانا۔

☆ راشد نے اپنے بیٹے دلآور کی تصویر پہچانی۔

☆ محمد یعقوب نے اپنے بیٹے محمد اظہر کی تصویر پہچانی

☆ غلام نے اپنے بیٹے عمران کی شلوار' قمیص اور تصویر پہچانی۔

☆ محمد امین نے اپنے بھتیجے محمد احمد کی شلوار، چپل اور تصویر شناخت کی۔

☆ نذیر احمد نے اپنے بھتیجے تنویر کی شلوار، قمیص اور تصویر پہچانی اور

☆ امیر حمزہ نے اپنے بیٹے شکیل کی تصویر پہچانی۔

مسعود عزیز کو 9 دسمبر 1999 کو ماڈل ٹاؤن لاہور کا ڈی ایس پی بنایا گیا۔ مسعود عزیز کو ایس ایس پی لاہور کا حکم ملا کہ جاوید اقبال کے کیس کی مزید تفتیش کی جائے۔ اس نے 28 دسمبر کو ٹیلیفون کے ذریعے محمد اشرف زاہد ایس ایچ او کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ جاوید اقبال کے گھر جائے اور مزید ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

30 دسمبر کو سوہاوا کے پولیس سٹیشن سے خبر ملی کہ ملزم ساجد اور ندیم مقامی بینک میں پکڑے گئے ہیں جہاں وہ ٹریولر چیک کیش کروا رہے تھے۔ ایس ایس پی لاہور نے فوراً ایک ٹیم تیار کی تاکہ ان ملزمین کو سوہاوا سے لاہور لایا جائے۔ اسی دن خبر ملی کہ جاوید اقبال ''جنگ'' اخبار لاہور میں خود ہی پہنچ گیا ہے اور جرنلسٹوں کو انٹرویو دے رہا ہے۔ اسے گرفتار کرنے کے لئے محمد ظہیر سب انسپکٹر جنگ اخبار کے دفتر پہنچے۔ جنگ اخبار کے جرنلسٹوں نے جاوید اقبال کا بیان لینے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کیا جو اسے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر لے آئے جہاں اس کی تلاشی لی گئی۔ اس وقت اس کی جیب سے دس ہزار روپے کے ٹریولر چیک، 148 پاکستانی روپے اور پوڈر کی پڑی نکلے۔ دوسری جیب سے 80 گولیوں کی ڈبی اور چابیاں نکلیں۔ اتنی دیر میں وہاں ملزمین ساجد اور ندیم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان سب کے بیانات لئے گئے۔

31 دسمبر 1999 کو مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ان تینوں ملزموں کا میڈیکل چیک اپ کرایا جائے چنانچہ لاہور کے میڈیکولیگل سرجن نے ان کا معائنہ کیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے جنگ اخبار کے ایڈیٹر جمیل چشتی اور جرنلسٹ اسد ساہی جنگ کا 31 دسمبر کا اخبار لے کر حاضر ہوئے اور اپنے بیانات دئے۔

11 جنوری 2000 کو جاوید کو اس کی بہن یاسمین یاس عرف ننھی کے گھر شاد باغ میں تلاشی کے لئے لے جایا گیا۔اس گھر کی دوسری منزل سے ایک لوہے کا ڈبہ دریافت ہوا۔اس ڈبے کو تالا لگا ہوا تھا۔ جاوید اقبال کے پاس اس ڈبے کی چابی تھی جو ایک بریف کیس میں تھی۔اس بریف کیس میں ایک سنگلی' ایک ماسک' ایک کیمرہ' ایک پستول اور کچھ پوڈر نما زہر موجود تھا۔سرفراز نے وہ سب پولیس کے لئے جمع کئے۔

12 جنوری 2000 کو محمد صابر کا باپ اپنے بیٹے کو لے کر سی آئی اے کے دفتر ماڈل ٹاؤن آیا جہاں پولیس نے صابر کو گرفتار کیا۔صابر اور جاوید اقبال کے بیانات لئے گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ٹوکے کے ذریعے لاشوں کے ٹکڑے کیا کرتے تھے۔جب پوچھا گیا کہ وہ ٹوکہ کہاں ہے تو کہنے لگے ہم نے راوی دریا میں پھینک دیا ہے۔اس وقت ایک غوطہ زن اللہ دتا کو ساتھ لے کر پولیس راوی دریا پر گئی اور جہاں جاوید اقبال نے بتایا کہ ٹوکہ پھینکا گیا تھا وہاں اللہ دتا نے بہت غوطے لگائے لیکن ٹوکہ نہ ملا۔

13 جنوری 2000 کو چاروں ملزموں کو مقامی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور ان سے بیانات لئے گئے۔ان ملزموں نے باری باری بتایا کہ وہ کہاں لڑکوں کو قتل کیا کرتے تھے اور پھر ان کی لاشوں کو ڈرم میں ڈالا کرتے تھے۔صابر نے یادگار کے پاس اس نالے کا بھی ذکر کیا جہاں انہوں نے کئی لاشیں بہائی تھیں۔ بیانات کے بعد ملزمین واپس جیل بھیج دیئے گئے۔

14 جنوری 2000 کو جنگ اخبار کے جمیل چشتی نے پولیس کو وہ وڈیو کیسٹ دیے جو انہوں نے ''جنگ' اخبار کے دفتر میں جاوید اقبال کا بیان لیتے ہوئے بنائے تھے۔جاوید اقبال نے وہاں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس پر جو اسکے ملازموں نے مظالم کئے تھے اس کی وجہ سے اس کی ماں بیمار ہو کر مر گئی تھی اور ماں کے مرنے کے بعد اس نے بدلہ لینے لے لئے تہیہ کیا تھا کہ وہ سو لڑکوں کو مارے تا کہ ان کی مائیں بھی روئیں۔اس نے بتایا کہ سو لڑکوں کو قتل کرنے کے لئے

اس نے ساجد، صابر اور ندیم کی مدد لی تھی۔ اس نے یہ بھی بیان دیا کہ 43 قتلوں کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ قتل سے پہلے وہ لڑکوں کی تصویریں لے گا۔ جب پوچھا گیا کہ اس نے مزید لڑکے کیوں قتل نہیں کیے تو اس نے کہا کہ اس کے پاس مزید تیزاب خریدنے کے پیسے تو تھے لیکن اس نے عہد کیا تھا کہ وہ صرف سو قتل کرے گا۔ جب جاوید اقبال کی ''جنگ'' اخبار کے دفتر میں تلاشی لی گئی تھی تو اس کی جیب سے نشہ آور گولیاں نکلی تھیں۔ اس نے اس کا بھی اقرار کیا کہ ایک دفعہ اس نے راوی دریا جا کر خودکشی کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن پھر لوٹ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے ملازموں نے اتنا مارا تھا کہ اس کے سر اور جبڑے کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

سید خلیل شہزاد نے، جس کی 314 راوی روڈ پر فوٹو گرافی کی دکان ہے، قرآن پر ہاتھ رکھ کر بیان دیا کہ جاوید اقبال نے اسے تصویریں بنانے کے لئے دی تھیں۔ اس نے کہا کہ اکثر گاہک صرف اچھی تصویریں بنانے کا کہتے ہیں لیکن جاوید اقبال نے ساری تصویریں ڈیویلپ کرنے کو کہا جو خلیل نے 22، 23 نومبر 1999 کو تیار کر کے دی تھیں۔

مرزا نذیر بیگ جو سرکلر روڈ کے پاشا کیمیکل میں کام کرتا ہے، نے بیان دیا کہ ساجد اس سے گندھک اور نمک کا تیزاب خریدا کرتا تھا۔

تمام ملزموں نے، جنہوں نے پولیس اور مجسٹریٹ کو بیان دیتے ہوئے اپنے جرائم کا اقرار کیا تھا، عدالت کے سامنے آ کر کہا کہ وہ معصوم ہیں اور ان سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔

ملزم جاوید اقبال نے کہا کہ اس نے مجسٹریٹ کو جو بیان دیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ اسے پولیس نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے جرائم کا اقرار نہ کیا تو اسے پولیس مقابلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ ''جنگ'' اخبار کا بیان بھی سچا نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے کسی بھی لڑکے کو قتل نہ کیا تھا۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ خود ''جنگ'' کے اخبار کے دفتر میں پہنچا تھا۔

ملزم شہزاد نے بھی جرم سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ اسے جاوید اقبال کی ڈائریوں کی

کوئی خبر نہ تھی۔ اس نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ وہ صرف ٹریول چیک کیش کرنے گیا تھا اور اسے پکڑ لیا گیا۔

ملزم ندیم نے کہا کہ وہ بے قصور ہے۔ وہ سوہاوا بینک ٹریول چیک کیش کرنے گیا تھا اور پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ اس کا لڑکوں کے قتل سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

ملزم صابر نے بھی کسی قتل کرنے سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ پولیس نے اسے جاوید اقبال کے بیان کی وجہ سے گرفتار کیا تھا حالانکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔

میں وکیلِ استغاثہ، وکیلِ صفائی اور ملزموں کے بیان تفصیل سے پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچا ہوں۔

یہ کیس میاں محمد اشرف طاہر نے شروع کیا تھا۔ اس کیس کے فیصلے کے لئے وکیلِ استغاثہ نے 105 شہادتیں پیش کیں۔ 17 شہادتوں کو غیر ضروری سمجھ کر واپس بھیج دیا گیا۔ وکیلِ استغاثہ نے عدالت میں ثابت کیا کہ ملزموں نے 100 معصوم بچوں کو قتل کیا ہے۔ وکیلِ استغاثہ نے بیان دیا کہ تمام شہادتوں نے بغیر کسی تعصب کے بیانات دئے ہیں۔ وکیلِ استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزموں کو پھانسی کی سزا دی جائے۔

وکیلِ صفائی نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ وکیلِ استغاثہ نے اپنا کیس ثابت کرنے کے لئے سو والدین کو عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بعض بچے صحیح سلامت گھروں کو واپس پہنچ گئے ہوں۔

وکیلِ صفائی نے کہا کہ ان قتلوں کی کوئی direct evidence نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی مردہ لاش نہیں پیش نہیں کی گئی۔ جاوید اقبال کے گھر سے جو ڈرم ملے ہیں اور ان میں جو کچھ موجود تھا اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ انسانی جسم کے حصے ہیں۔

وکیلِ صفائی نے کہا کہ جنگ اخبار کا وڈیو مستند نہیں ہے کیونکہ وہ کسی مجسٹریٹ کے

سامنے نہیں بنایا گیا تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ وڈیو جاوید اقبال پر دباؤ ڈال کر بنایا گیا ہو۔

وکیل، صفائی نے کہا کہ سارا کیس سنی سنائی باتوں (circumstantial evidence) پر تعمیر کیا گیا ہے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس نے کہا کہ مردہ لاشوں کی غیر موجودگی میں کسی پر قتل کا الزام کیسے ثابت ہوتا ہے۔

عدالت کے سامنے ڈاکٹر امتیاز بھٹی پیش کئے گئے جنہوں نے ساجد اور ندیم کا طبی معائنہ کیا تھا اور رپورٹ میں لکھا تھا کہ ان کے ساتھ عقبی مباشرت (sodomy) کی گئی تھی۔

عدالت میں ڈاکٹر محمد ریاض بھی پیش ہوئے جو کنگ میڈیکل کالج کے اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔انہوں نے بیان دیا کہ جاوید اقبال کے گھر سے ڈرموں سے جو ہڈیاں ملی تھیں وہ انسانوں کی ہڈیاں نہیں تھیں۔

مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ پولیس نے جاوید اقبال کے گھر دوبارہ جا کر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا اور وہاں سے کچھ ہڈیاں اٹھا کر لے آئے تھے جو انسانی ہڈیاں نہیں تھیں۔میں پولیس کے ایسے رویے کی مذمت کرتا ہوں۔

میں نے مقتولوں کے لواحقین سے بھی بات چیت کی ہے اور مجھے یہ جان کر دکھ ہوا ہے کہ پولیس افسروں نے ان غریب والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا۔چونکہ ان کے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے پولیس نے ان کے بچوں کے FIR نہیں بنائے۔یہ ایک تشویشناک بات ہے اور اس کی رپورٹ علیحدہ سے پولیس حکام کو بھیجوں گا۔

وکیلِ صفائی نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ شہزاد ندیم اور صابر اٹھارہ سال سے کم ہیں اس لئے انہیں نابالغ سمجھا جائے جبکہ وکیلِ استغاثہ نے کہا ہے کہ چونکہ وہ جسمانی طور پر بلوغت تک پہنچ چکے ہیں اس لئے انہیں بالغ سمجھا جائے۔میری نگاہ میں جسمانی بلوغت کے ساتھ ساتھ ذہنی بلوغت بھی اہم ہے اس لئے میں ندیم اور صابر کو نابالغ اور سجاد کو بالغ سمجھتا ہوں۔

جہاں تک جاوید اقبال کا تعلق ہے وہ ایک شادی شدہ انسان ہے۔ اس کی دو بیویاں تھیں اور دو بچے تھے۔ وہ ان سے سولہ سال سے جدا ہو چکا ہے اور وہ اپنے بچوں سے کبھی نہیں ملا۔ جاوید اقبال نے عدالت کو دھوکہ دینے کی بہت کوشش کی ہے۔ وہ اپنے بیانات بدلتا رہا ہے۔

وہ انسان کے بھیس میں ایک شیطان ہے۔ درحقیقت وہ ایک جانور ہے اور ایسے ظالم انسان کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے ... اس عدالت کے سامنے استغاثہ نے ثابت کر دیا ہے اور خدا کے فضل سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ملزم نے سو بچوں کا قتلِ عمد کیا ہے اور قتل کرنے کے بعد ان بچوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان تیزاب کے ڈبوں میں تحلیل کیا ہے جو اس کے گھر سے ملے ہیں۔ اس جرم کی سزا کے طور پر مجرم کو سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اس کی لاش کے بھی سو ٹکڑے کیے جائیں گے اور پھر ان ٹکڑوں کو بھی تیزاب کے ڈبوں میں ڈالا جائے گا۔

استغاثہ نے ثابت کیا ہے کہ شہزاد نے 98 لڑکوں کا قتل عمد کیا ہے۔ اسے بھی سولی پر چڑھایا جائے گا اور اس کی لاش کے بھی 98 ٹکڑے کیے جائیں گے اور ان ٹکڑوں کو بھی تیزاب کے ڈبوں میں ڈالا جائے گا۔

استغاثہ نے ثابت کیا ہے کہ ندیم نے بھی 13 قتلِ عمد کیے ہیں۔ چونکہ وہ نابالغ ہے اس لئے اسے ہر قتل کے لئے چودہ سال کی قید دی جائے گی جو مل کر ایک سو بیاسی (182) سال بنتی ہے۔ اسے ہر قتل کی وجہ سے 253'625 روپے جرمانہ بھی کیا گیا ہے۔

استغاثہ نے ثابت کیا ہے کہ صابر نے تین قتلِ عمد کئے ہیں۔ چونکہ وہ نابالغ ہے اس لئے اسے ہر قتل کی وجہ سے چودہ سال قید کی سزا دی جاتی ہے جو کلی طور پر بیالیس (42) سال بنتی ہے۔ اسے بھی ہر قتل کو جرمانہ 253'625 روپے دینا پڑے گا۔

یہ تمام سزائیں ہائی کورٹ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ میں ہائی کورٹ کے جج کو مشورہ دیتا ہوں کہ جاوید اقبال اور ساجد کو پھانسی کی سزا مینارِ پاکستان کے کھلے میدان میں لواحقین

کے سامنے دی جائے تاکہ عوام کو اس سزا سے عبرت حاصل ہو۔''

اللہ بخش رانجھا

ایڈیشنل سیشنز جج لاہور

چوبیسواں باب ... این اگیری سے مکالمہ

جب سے میں پاکستان سے واپس آیا تھا اور کتاب کے لئے تحقیق کر رہا تھا این کی اور میری مختلف موضوعات پر سنجیدہ بحثیں ہوئی تھیں۔این کے ذہن میں بار بار جاوید اقبال کے روحانی تجربات اور اسکی پھانسی کی سزا (capital punishment) کے بارے میں بیسیوں سوال اٹھ رہے تھے چنانچہ ایک دن ہمارے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا۔

این: اب جب آپ پچھلے سال کے بارے میں سوچتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ آپ کس جذبے کے تحت جاوید اقبال کا انٹرویو لینے پاکستان گئے تھے؟

سہیل: میں نے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا تھا۔میرے اس سفر میں بہت سے غیر معمولی واقعات پیش آئے۔زندگی نے مجھے میری توقعات سے زیادہ تحفے دئے۔جاوید اقبال کی زندگی کی طرح وہ سفر بھی پراسرار تھا۔میں کچھ ایسے لوگوں سے ملا اور ایسی جگہوں پر گیا جہاں میں کبھی نہ جاتا۔سفر کے بعد کتاب لکھنے کا تجربہ بھی غیر معمولی تھا۔میں نے اس سے پہلے کوئی ایسی کتاب تخلیق نہ کی تھی جس میں میری پیشہ ورانہ زندگی اور تخلیقی زندگی آپس میں گھل مل گئے تھے۔جاوید اقبال کی کہانی کی تفاصیل جانتے ہوئے مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ہم سب کی ذاتی' معاشرتی' مذہبی اور سیاسی زندگیاں کس طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مغرب میں بسنے والوں کو مشرقی زندگی کے بارے میں بہت سے انکشافات کرے گی۔ہم چاہے ایک ہی عہد میں رہتے ہوں لیکن ہم ابھی تک مختلف دنیاؤں میں بستے ہیں۔

این۔اس کہانی میں میرے لئے سب سے زیادہ حیران کن حصہ باباجی کا یہ کہنا تھا کہ جاوید اقبال ایک برگزیدہ انسان ہے۔جاوید اقبال کے روحانی تجربات کے بارے میں آپ کی کیا رائے

ہے؟

سہیل: جاوید اقبال کے روحانی تجربات کو جاننے کے لئے ہمیں اس معاشرے کی مذہبی اور ثقافتی روایات کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ تیسری دنیا کے بہت سے ممالک کی طرح پاکستان میں بھی لاکھوں لوگ ایسے بستے ہیں جو ابھی تک مافوق الفطرت چیزوں اور توہمات پر یقین کرتے ہیں۔ وہ کرامات اور معجزوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ بہت سی بانجھ عورتیں ابھی بھی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کی بجائے کسی مزار پر جا کر نمک کھانے یا چادر چڑھانے کو ترجیع دیتی ہیں۔

ایسے سادہ لوح لوگ بزرگوں کی کرامات کو ماننے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے معاملات میں عقل و دانش کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔ بابا جی نے ضرور جاوید اقبال میں کوئی خاص بات دیکھی ہوگی جو ایسی پیشین گوئی کی۔ چونکہ ان کے سامنے سب ان کے مرید بیٹھے تھے اس لئے وہ ان کی باتوں پر ایمان لے آئے اور جاوید اقبال کو مقامی مسیحا مان لیا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بابا جی جاوید اقبال کو اپنا مرید بنا کر اپنی زیارت پر لے جانا چاہتے تھے لیکن جب جاوید اقبال کے والد راضی نہ ہوئے تو وہ ناراض ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ ساری دنیا میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو توہمات پر ایمان رکھتے ہیں۔ مغرب میں بھی بہت سے لوگ عیسائی بزرگوں کی درگاہوں پر جاتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں اور کرامات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کی بجائے روحانی پیشواؤں faith healers کے پاس جاتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ جاوید اقبال کی کہانی کے بعض حصے میرے لئے بھی چیستان سے کم نہیں۔ جب جاوید اقبال پر حال آتے تھے اس وقت اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ایک دلچسپ تجربہ ہوتا۔ لیکن میں یہ سب باتیں ایک نفسیات کے طالبعلم کے طور پر کر رہا ہوں، روحانیات کے ماہر کے طور پر نہیں۔ چونکہ میں معجزوں پر ایمان نہیں رکھتا اسلئے واقعات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔

میرا ایمان ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو قوانینِ فطرت کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں اور تمام سائنسدان چاہے وہ ماہرینِ نباتات ہوں یا ماہرینِ نفسیات انہی قوانین کی تلاش میں رہتے ہیں۔سائنس کے طالب علم اندھے ایمان کی راہ پر نہیں چلتے اس لئے بعض دفعہ سائنسدانوں اور مذہبی لوگوں کا مکالمہ نہیں ہوسکتا۔انسانی تاریخ میں بہت کم ماہرین ایسے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے روحانی تجربات کو مذہب کی بجائے سائنس کی نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔پچھلی صدی میں ولیم جیمز William James نے اپنی کتاب Varieties of Religious Experience اور ابراہم میسلو Abraham Maslow نے اپنی کتاب Religions, Values and Peak Experiences میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جنہیں پڑھنے کا میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا رہتا ہوں۔ان ماہرین نے مذہبی اور روحانی تجربات کے بارے میں سیکولر اور سائنسی نقطۂ نظر اپنایا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم ابھی انسانی ارتقا کی اس منزل تک نہیں پہنچے جہاں سائنسدان اور روحانیات کے ماہر ایک دوسرے سے صحتمند مکالمہ کرسکیں۔ہم نے ابھی ایسے الفاظ تخلیق نہیں کئے جو مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں کے درمیان پل کا کام کرسکیں۔میں نے ان مسائل کی طرف اپنی کتاب From Islam To Secular Humanism میں چند اشارے کئے ہیں۔

این: آپکا، جاوید اقبال کے مذہب اور خدا سے رشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سہیل: میری نگاہ میں وہ جاوید اقبال کی زندگی کا سب سے بڑا تضاد ہے۔وہ ایک طرف سو بچوں کو قتل کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور دوسری طرف اس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے خدا سے دعائیں مانگتا تھا۔میں نے جب اس کی ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔اس نے سو بچوں کے قتل کی تفصیل لکھنے کے بعد لکھا تھا۔

”13 نومبر ... ڈرم میں ڈال کر سب نے گلے مل کر گنتی مکمل ہونے پر مبارکباد دی۔آج خدا کی

شان اور مہربانی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب نے مربہ منگوا کر مجھے کھلایا۔ سارا دن جشن منایا اور سب شام کو گھر چلے گئے۔

این: آپکی گفتگو اور تحریروں سے واضح ہے کہ آپ پھانسی کی سزا کے حق میں نہیں ہیں۔ مغرب میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جیل میں بیسیوں سیریل قاتلوں کو برسوں زندہ رکھنے سے بہتر ہے کہ انہیں پھانسی کی سزا دے دی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک قاتل کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیں تقریباً پچاس ہزار ڈالر سالانہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہی رقم انسانی فلاح و بہبود کے دیگر کاموں پر خرچ کر سکتے ہیں۔

سہیل: میری نگاہ میں یہ مسئلہ معاشی نہیں اخلاقی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ انسانوں کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی اور انسان کی زندگی کا فیصلہ کریں اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیں۔ میرا ایمان ہے کہ ہمیں انسانی زندگی کا احترام کرنا چاہئے۔ ہمیں قاتلوں سے معصوم لوگوں کو بچانا چاہئے اور انہیں معاشرے سے علیحدہ رکھنا چاہئے لیکن ہمیں ان کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر جج یا جیوری Jury یا عوام قاتل کو قتل کرتے ہیں تو ان میں اور قاتل میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟۔ چونکہ میں انسان دوستی Humanism پر ایمان رکھتا ہوں اسلئے ایرک فرام کے اس قول کو مانتا ہوں ''ایک ذہنی مریض اور ایک مجرم بھی اتنا ہی انسان ہے جتنا کہ ایک ولی اللہ۔''

میرا یہ بھی خیال ہے کہ اکثر قاتل غصے یا ناسازگار حالات کی وجہ سے زندگی میں صرف ایک دفعہ قتل کرتے ہیں۔ اس کے بعد چاہے انہیں جیل میں رکھا جائے' ہسپتال میں یا معاشرے میں' وہ کوئی اور قتل نہیں کریں گے۔ ہمیں معصوموں کی جان کی حفاظت تو کرنی چاہئے لیکن دوسروں کی جان لے کر نہیں۔ ہمیں سیریل قاتلوں کو خیال رکھنے کے لئے مناسب اقدامات کرنے چاہئیں؟

این: کس قسم کے اقدامات؟

سہیل: وہ لوگ جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکات کرتے ہیں ان کے بارے میں لوگ دو طرح کے رجحانات رکھتے ہیں۔ایک گروہ انہیں مجرم اور گنہگار قرار دیتا ہے اور انہیں مختلف قسم کی سزائیں دینا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور ان کی مدد کرنا چاہتا ہے تا کہ وہ ایک صحتمند طرزِ حیات اختیار کر سکیں۔ میرا تعلق دوسرے گروہ سے ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے قاتل اور مجرم تخلیقی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔ اگر انہیں جیل میں لکھنے کی اجازت دی جائے تو وہ شہ پارے تخلیق کر سکتے ہیں جن سے معاشرے کو بالواسطہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ جن کو پھانسی کی سزا ملی تھی وہ مرنے کے بعد معصوم ثابت ہوئے اور ہمیں صحیح قاتلوں کا پتہ چلا۔ میرے نزدیک کسی معصوم انسان کو شک کی بنیاد پر سولی پر چڑھا دینا بہت بڑی ناانصافی ہے۔

کسی ملزم کا خود اقرارِ جرم کرنا میری نگاہ میں ناکافی ثبوت ہے۔شمالی امریکہ میں بہت سے ملزموں نے قتل کا اقرار کیا اور بعد میں ثابت ہوا کہ انہوں نے شہرت حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا تھا۔کلفرڈ اولسن نے پچاس قتلوں کا' ہنری لی لیوکس نے سو سے زیادہ قتلوں کا اور مائیکل میگرے نے تیرہ قتلوں کا اقرار کیا لیکن پولیس کی تحقیق نے ثابت کیا کہ وہ سب جھوٹے تھے۔ پاکستان جیسے ملک میں تو پولیس کی رپورٹیں بھی ناقابلِ اعتبار ہیں کیونکہ بہت سے پولیس افسر غیر ذمہ دار ہیں۔ وہی پولیس افسر جن کی گواہی پر جاوید اقبال کو پھانسی کی سزا ہوئی بعد میں خود اسحاق بلا کے قتل میں جیل بھیجے گئے۔ یہ چند ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں پھانسی کی سزا کے حق میں نہیں ہوں۔ میری نگاہ میں ہمیں ایسی جیلیں بنانی چاہئیں جن میں ملزموں اور مجرموں کی ذہنی تربیت ہو سکے۔ یورپ میں چند ایسی جیلیں بنائی گئی ہیں جو Therapeutic Prisons کہلاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ملک کے وکیلوں' ججوں' سیاستدانوں اور دانشوروں

کو سر جوڑ کر اس گھمبیر مسئلے پر غور کرنا چاہئے۔

این۔ میں آپ سے ایک آخری سوال کرنا چاہتی ہوں۔ اس پوری تحقیق میں کیا آپ کو جاوید اقبال اور جج میں کوئی مماثلت نظر آئی؟

سہیل: ایک نہیں بہت سی مماثلتیں... دونوں ایک ہی ملک اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، دونوں غصے اور نفرت کی ترجمانی کرتے ہیں، دونوں کے دلوں میں بدلہ لینے کا جذبہ موجود ہے، دونوں دوسروں کی جانیں لیتے وقت خدا کا نام لیتے ہیں اور دونوں کی خواہش ہے کہ وہ اتنے مشہور ہوں کہ تاریخ کی کتابوں میں ان کا نام زندہ رہے۔

==========

پچیسواں باب ... قیامت کا دن

آج 16 مارچ 2001 ہے اور میں پورے ایک سال پہلے کی اس شام کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب میں نے مقامی ٹیلی وژن پر جاوید اقبال اور جج کی تصاویر دیکھی تھیں اور ایک انجانے سفر پر پاکستان روانہ ہو گیا تھا۔ وہ سفر جو پراسرار بھی تھا اور گنجلک بھی۔ اس سفر نے میرے دامن کو بہت سے نادر تجربات سے بھر دیا ہے میں انسانی ذات کے ان تاریک گوشوں میں جھانک چکا ہوں جو اس سے پہلے میری نگاہون سے اوجھل تھے۔ میں جب بھی اس دن کے بارے میں سوچتا ہوں جس دن جاوید اقبال کا جج سے سامنا ہوا تھا میرے ذہن کے کینوس پر مندرجہ ذیل نقشہ ابھرتا ہے۔

اس دن سورج سوا نیزے پر تھا

دھوپ کی شدت سے

زبانیں سوکھ گئی تھیں

چہرے جھلس گئے تھے

پھول مرجھا گئے تھے

چاروں طرف حشر کا سا سماں تھا۔

لاہور کی تاریخ میں کسی عدالت میں پہلے کبھی اتنی گہما گہمی نہ دکھائی دی تھی۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سروں پر رومال اور چادریں رکھے عدالت لگنے سے گھنٹوں پہلے وہاں موجود تھے۔ ان میں جاوید اقبال کے

دوست بھی شامل تھے، رشتہ دار بھی

اپنے بھی شامل تھے، بیگانے بھی

ہمسائے بھی شامل تھے، رفیقِ کار بھی
محبوب بھی شامل تھے، رقیب بھی
اس دن کچہری میں شہر بھر کے
وکیل بھی چلے آئے تھے، جرنلسٹ بھی
ولی اللہ بھی حاضر ہو گئے تھے، پاپی بھی
وہ سب مقدمے کا فیصلہ سننے آئے تھے
وہ سب جج کی راہ تک رہے تھے۔
وہ سب اس سیریل قاتل کے سیریل کی آخری قسط دیکھنے آئے تھے۔

جب جج اپنے مخصوص سیاہ لبادے میں ملبوس عدالت میں داخل ہوا تو چاروں طرف خاموشی پھیل گئی۔ایسی خاموشی جس کی وحشت اور دہشت سے لوگوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ پہلے تو جج نے چاروں طرف ایک سنجیدہ نگاہ ڈالی جیسے وہ سینکڑوں نگاہوں کو اپنی ذات پر مرکوز دیکھ کر اس تاریخی لمحے میں اپنی اہمیت کا اندازہ لگا رہا ہو یا سوچ رہا ہو کہ اس دن کا ہیرو جاوید اقبال ہے یا وہ خود، اور پھر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے آہستہ آہستہ مقدمے کا فیصلہ سنانا شروع کیا‘‘...وکیلِ استغاثہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جاوید اقبال نہ صرف سو بچوں کے قتلِ عمد کا مرتکب ہوا ہے بلکہ وہ ان بچوں کی لاشوں کے ٹکڑے کر کے انہیں تیزاب کے ڈرموں میں تحلیل بھی کرتا رہا ہے۔

جاوید اقبال نے جو ڈائریاں اور تصویریں پولیس کو بھیجی تھیں اور جو بیانات جنگ اخبار کے دفتر میں دیے تھے ان سے بھی اس گھناؤنے جرائم ثابت ہوتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ اب وہ ان بیانات سے مکر گیا ہے کیونکہ وہ ایک جھوٹا انسان ہے۔‘‘ لیکن پھر اچانک اس کے چہرے کا

رنگ سرخ ہو گیا' ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور اس کے منہ میں جھاگ بھر گئی۔ '' جاوید اقبال جھوٹا ہے' دھوکہ باز ہے' شیطان ہے۔ وہ انسان کی شکل میں حیوان ہے۔ وہ انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ وہ ساری قوم کے لئے باعثِ ندامت ہے''۔

پھر جج نے ایک لمبا سانس لیا '' اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کی سزا یہی ہوسکتی ہے کہ اسے مینارِ پاکستان کے میدان میں سب کے سامنے سولی پر چڑھایا جائے تاکہ معصوم بچوں کے لواحقین اسے مرتا دیکھ سکیں۔ پھر اس کی لاش کو سو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جائے اور اسی تیزاب کے ڈرم میں ڈالا جائے جس میں وہ مردہ بچے ڈالا کرتا تھا تاکہ عوام کو عبرت حاصل ہو... ''

جج فیصلہ سنا چکا تو اس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے وہ تالیوں کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ اس ڈرامے کا خود ساختہ ہیرو تھا۔ اسے اچانک اندازہ ہوا کہ شدتِ جذبات میں نہ کہنے والی باتیں بھی کہہ گیا تھا۔

اس کا فیصلہ سن کر حاضرین کے چہروں پر اداسی' غم' غصہ' نفرت' حقارت اور پریشانی کے جذبات ابھر آئے تھے لیکن جاوید اقبال کا چہرہ پہلے کی طرح پر سکون تھا۔

اس کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور ہاتھ میں سو ہڈیوں کی تسبیح' ایسی تسبیح جسے دیکھ کر لوگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، اس تسبیح کے راز سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی؟ کس نے بنائی تھی؟ کیسے بنائی تھی؟ بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آئے تھے لیکن کسی کو جاوید اقبال سے وہ سوالات پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔

جاوید اقبال سینکڑوں انسانوں میں گھرا یوں محسوس کر رہا تھا جیسے
وہ اپنے دور کا مسیحا ہو جس نے کانٹوں کا ہار پہن رکھا ہو
وہ اپنے عہد کا سقراط ہو جسے زہر کا پیالہ پیش کیا گیا ہو

وہ اپنی صدی کا منصور ہو جسے مصلوب کرنے کا فیصلہ سنایا گیا ہو

اسے قرآن کی وہ آیات یاد آ گئیں جن میں خضر نے ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا تھا اور موسیٰ کے اعتراض کرنے پر وضاحت کی تھی۔

یہ تصوف کی باتیں جو تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یہ ایک ایسا راز ہے جو ہر کسی پر افشا نہیں ہوتا۔ طریقت کی باتیں شریعت کی سمجھ نہیں آیا کرتیں۔

شریعت کا کام تو فتوے دینا ہے

لوگوں کو گنہگار ثابت کرنا ہے

لوگوں کو سنگسار کرنا اور سولی پر چڑھانا ہے

چاہے وہ مولوی ہو یا جج، مسجد ہو یا عدالت کس نے فتویٰ نہیں لگایا

جس نے بھی معاشرے کے ناسوروں کو چھیڑا وہ مردود ٹھہرا

جس نے بھی ماحول کو بہتر بنانا چاہا وہ راندۂ درگاہ ٹھہرا

جس نے بھی روایت کو توڑا سولی پر چڑھا

جاوید اقبال اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ اس نے اپنے معاشرے کی روایات کو چیلنج کیا ہے جس کی سزا موت ہے اور وہ اپنی موت کے لئے تیار تھا۔ اسی لئے اس کے چہرے پر سکون تھا ایسا سکون جس نے سب حاضرین کو مضطرب کر رکھا تھا۔ جاوید اقبال اپنے دل کی گہرائیوں میں جانتا تھا کہ وہ ایک برگزیدہ انسان تھا اور اس کی قوم پر عذاب آ رہا تھا کیونکہ اسکی قوم نے اسکا اور اسکی ماں کا دل دکھایا تھا اور اس بات کی بابا جی نے اسکے بچپن میں ہی پیشین گوئی کر رکھی تھی۔

==========

چھبیسواں باب ... سچ کی خودکشی یا قتل

دس اکتوبر 2001 کو میرے دوست زاہد لودھی نے مجھے ایک اخبار کا کالم بھیجا جس میں تحریر تھا کہ لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں جاوید اقبال اور اسکے ساتھی ساجد نے اپنی اپنی کوٹھڑیوں کی چھتوں سے بستر کی چادروں سے لٹک کر خودکشی کر لی۔ یہی خبر ٹورانٹو کے اخبار ''سن'' (SUN) میں بھی چھپی۔

میری رفیقِ کار این Anne نے خبر پڑھ کر مجھ سے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرے لئے اس خبر پر یقین کرنا بہت مشکل ہے'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کیوں؟''

''کئی وجہ سے۔ اول تو یہ بعید از قیاس ہے کہ دو انسان مختلف کمروں میں بیک وقت خودکشی کریں اور وہ بھی چھت سے لٹک کر۔ اگر وہ دونوں ایک ہی کمرے میں ہوتے اور اکٹھے زہر کھا لیتے یا بندوق کی گولیوں سے مرجاتے تو یقین کیا جاسکتا تھا۔ میں جاوید اقبال سے ملنے اس کوٹھڑی میں گیا تھا اس کی چھتیں بہت اونچی تھیں اور دیواروں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ چادر سے لٹک سکتے۔''

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا ہوا ہے؟''

''اگر مستقبل میں کوئی مجھے یہ بتائے گا کہ کسی نے ان دونوں کو قتل کر دیا ہے تو مجھے بالکل حیرانی نہ ہوگی''۔

اگلے چند دنوں میں مزید خبریں آئیں تو پتہ چلا کہ دونوں کی موت رات بارہ بجے سے صبح دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ جو افسر اس وقت ڈیوٹی پر تھا وہ خبر دیئے بغیر پراسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا۔ جو نیا افسر ڈیوٹی پر آیا تھا اس نے بھی کسی کو خبر نہ دی تھی۔ جب صبح

واردات کا پتہ چلا تو سب کچھ مشکوک دکھائی دے رہا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتایا کہ مردوں کے جسم پر چھت سے لٹکنے(hanging) کے نشان نہ تھے۔ انہیں گلا گھونٹ کر(strangulation) مارا گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کا نہیں قتل کا واقعہ تھا۔

جاوید اقبال اور ساجد کی موت اسحاق بلا کی موت سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ حکومت نے جاوید اقبال اور ساجد کے المیے کے بعد افسرانِ بالا کی تفتیش شروع کر دی ہے۔ اسی طرح جس طرح اسحاق بلا کی موت پر پولیس افسروں پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔

یہ ایک دلچسپی کی بات ہے کہ جاوید اقبال کی موت سے کچھ عرصہ پیشتر ہائی کورٹ نے اس کا کیس اسلامی شریعت کورٹ میں بھیج دیا تھا۔ جاوید اقبال کے وکیل فیصل نجیب کا خیال تھا کہ جاوید اقبال کے خلاف حکومت کا کیس اتنا کمزور تھا اور جج کے فیصلے میں اتنی خامیاں تھیں کہ جاوید اقبال کے بری ہونے کے امکانات درخشاں تھے۔ وکیل کا خیال ہے کہ جیل اور پولیس کے حکام نہیں چاہتے تھے کہ سچی کہانی منظر عام پر آئے چنانچہ انہوں نے خود جاوید اقبال اور ساجد کے قتل کا منصوبہ بنایا۔

جاوید اقبال نے بھی ہائی کورٹ سے درخواست کی تھی کہ اسے پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ جیل میں ہونے والی ناانصافیوں کو عوام کے سامنے لا سکے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جیل میں اسکے کھانے کی پلیٹ میں بلیڈ ڈال کر اسے خودکشی پر اکسایا جاتا تھا۔ اس کا ابھی بھی دعویٰ تھا کہ اس نے سو بچوں کو قتل نہیں کیا اور وہ کسی خفیہ جگہ پر زندہ اور محفوظ ہیں۔ وہ مصر تھا کہ حکومت، پولیس اور عدلیہ اس سے ڈرتی ہے کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ سچ عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔

مرنے کے بعد جاوید اقبال کی لاش لینے کوئی دوست، رشتہ داریا ہمسایہ نہیں آیا۔ حیرت

کی بات یہ تھی کہ جاوید اقبال کی موت کے بارے میں مجھے ساری دنیا سے بیسیوں فون اور ای میل e-mail آئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے وکیل کے علاوہ ساری دنیا میں میں واحد شخص تھا جسے اس سے کوئی ہمدردی تھی۔

جاوید اقبال کی موت بھی اسکی زندگی کی طرح غیر معمولی اور پراسرار تھی۔ کئی پاکستانی اخباروں میں یہ خبریں چھپی ہیں کہ اس کی قبر سے رات کی تاریکی میں پھنکارتے ہوئے سانپ نکلتے ہیں لیکن دن کی روشنی میں جب پولیس افسر انہیں مارنے جاتے ہیں تو وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ میری نگاہ میں وہ سانپ جاوید اقبال کے بدنامِ زمانہ ہونے کے ڈراؤنے خواب اور عوام کے نفسیاتی ہیجان کے آئینہ دار ہیں۔ جاوید اقبال نے ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزاری جہاں لوگوں کو حقائق کی بجائے توہمات زیادہ مرغوب ہیں' جہاں لوگ عقل و دانش کی بجائے گنڈوں تعویزوں پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور جہاں ملزموں کو انصاف کی عدالت سے ناانصافی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

کیا جاوید اقبال نے خودکشی کی یا اسے قتل کر دیا گیا؟

یہ سوال عوام اور خواص کے ذہنوں اور ضمیروں میں مدتوں کچوکے لگاتا رہے گا اور جاوید اقبال کی کہانی اگلے چند سالوں' دہائیوں اور صدیوں میں آہستہ آہستہ دیومالائی ادب کا حصہ بن جائے گی اور لوگ یہی سوچتے رہیں گے کہ کیا وہ ایک ملزم تھا' ایک مجرم تھا' ایک پاپی تھا یا ایک برگزیدہ انسان؟

==========

خالد سہیل کی دیگر تخلیقات

1۔تلاش (شاعری)

2۔آزاد فضائیں (شاعری)

3۔زندگی میں خلا (افسانے)

4۔دو کشتیوں میں سوار (افسانے)

5۔دھرتی ماں اداس ہے (افسانے)

6۔دریا کے اس پار (ناولٹ)

7۔ٹوٹا ہوا آدمی (ناول)

8۔بھگوان۔ایمان۔انسان (فلسفہ)

9۔مغربی عورت' ادب اور زندگی (تراجم)

10۔کالے جسموں کی ریاضت (افریقی ادب)

11۔ورثہ (لوک کہانیاں)

12۔ایک باپ کی اولاد (مشرقِ وسطیٰ)

13امن کی دیوی (خلیج کی جنگ)

14۔ہر دور میں مصلوب (گے اور لیسبین ادب)

15۔انفرادی اور معاشرتی نفسیات (مضامین)

16۔اک پیرو چ زنجیر (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)